PAKISTANIPOINT

آوارہ گرد کی ڈائری

سفرنامہ

ابن انشا

PAKISTANIPOINT

PAKISTANIPOINT

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب: آوارہ گرد کی ڈائری

پہلی بار: جولائی 1974ء

چھبیسویں بار: جون 2019ء

ناشر: سردار طاہر محمود

مطبع: دانیال راجہ پرنٹرز، لاہور

قیمت -/660 روپے

www.pakistanipoint.com

مارک ٹوین نے اپنے ایک ناول کے دیباچے میں لکھا تھا:

> اگر کوئی شخص اس کہانی میں مقصد تلاش کرتا ہوا پایا گیا تو اس پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ اگر کسی شخص نے اس کتاب سے سبق لینے کی کوشش کی تو اسے ملک بدر کر دیا جائے گا۔ اور اگر کسی نے اس میں پلاٹ تلاش کرنے کی جرأت کی تو اسے گولی مار دی جائے گی.....

ہم طبیعت کے ایسے متشدد نہیں ہیں جیسے مارک ٹوین تھے۔ تاہم اتنا خبردار کریں گے کہ اگر کسی نے اس سفرنامے سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو یہ اچھا نہ ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص اس سفرنامے کو گائیڈ بنا کر اس کی مدد سے سفر کرنے کی کوشش کرے گا، نتائج کا خود ذمہ دار ہوگا۔ اصل میں یہ اس قسم کا سفرنامہ نہیں جو سفر کے اختتام پر لکھا جاتا ہے۔ یہ تو ایک آوارہ گرد کی آوارہ ڈائری کے منتشر اوراق ہیں۔ ۱۹۶۷ء کے اواخر میں ہم یونیسکو کی دعوت پر یورپ اور مشرق وسطیٰ کے ملکوں کے دورے پر گئے تھے۔ وہاں جو کچھ ہم پر اور ان ملکوں پر ہمارے ہاتھوں گزرتی رہی بے کم و کاست رقم کر کے اخبار میں بھیج دیا کرتے تھے پچھلی قسط میں کیا لکھا تھا یہ کبھی یاد نہ رہا۔ چونکہ ہمیں جم کر لکھنے کی کبھی عادت نہیں رہی لہذا جو رہ گیا سو رہ گیا۔ مثلاً چیکوسلوویکیا کی راجدھانی پراگ میں ہم نے جو چار بوہمین دن گزارے، وہ یادگار دن تھے۔ سوچا ان پر ذرا بیٹھ کر دلجمعی سے لکھیں گے، سو یہ نہ ہوا۔ وہ

PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

دن بھی نہ آیا۔ وارسا کی یاترا کی روداد بھی نہ لکھ سکے کہ اب کون لکھے۔ یہی حال لوسرن (سوئٹزرلینڈ) کے احوال کا ہے۔ اب تو ان کی یادیں سپنوں کے سمان ہیں۔

ہمارا یہ سفر پورے تین مہینے کا تھا۔ ایک مہینہ لندن میں۔ دو ہفتے جرمنی میں اور باقی ایام میں باقی دیار و امصار۔ یونیسکو کا روزانہ بھتہ ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص کسی اونچے ہوٹل میں ٹھہر سکے اور کام و دہن کی معقول تواضع کر سکے۔ فائدہ یہ کہ مسافر میں تن آسانی پیدا نہیں ہوتی۔ ریاضت اور مجاہدے کے معنی سے آشنا ہو جاتا ہے۔ پیدل چلتا ہے اور بھوک رکھ کر کھاتا ہے (اگر کھاتا ہے تو) اس کا صحت پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے ہم بھی اپنے بدن سے ۲۰ پونڈ گھٹا کر لوٹے تھے۔ شاید یونیسکو کا منشا بھی یہی تھا۔ جوتا بھی ایک گھس گیا۔ دوسرا خریدنا پڑا۔ ایک بات ہے البتہ ان چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں نے جن میں بعض کے دروازے ادوائن سے کھلتے بند ہوتے تھے اور ان کے غسل خانوں نے ہمیں لکھنے کا مواد بہت کچھ مہیا کیا۔

بارہ ولایتوں اور ستائیس شہروں کا یہ سفر بہت سے اور سفروں اور آوارگیوں کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا لیکن ان کی داستان طویل ہے اور چونکہ مشرق بعید، امریکہ اور یورپ سب کو محیط ہے اس لیے اس کا نام ہم نے دنیا گول ہے تجویز کیا ہے۔ یہ پڑھنے کے بعد جی چاہے تو اسے بھی پڑھیے۔

۲۲ مئی ۱۹۷۱ ابن انشا

اس کتاب کے کارٹون جمشید (جمشید انصاری) نے بنائے ہیں۔
البتہ پیرس ے باب میں جن کارٹونوں کے نیچے DL لکھا ہے وہ
ڈیوڈ لینگڈن کے ہیں غیر کارٹونی نقوش دوسری جگہ سے لیے گئے
ہیں۔

www.pakistanipoint.com

ترتیب

پیرس

یہ پیرس کا ہوٹل مالا رہے 11
آنا فائر بریگیڈ کا مرزا نسیم بیگ کے گھر 16
متفرقاتِ پیرس 25

لندن

لندن سے ایک خط 31
کچھ قصۂ دال چپاتی کا 44
کچھ چکھوتیاں کلچر کی 50
ٹاور سے موم گھر تک 55
گورے دیکھے، کالے دیکھے 63
بیان لذتِ آوارگی کا 69
ہائے بشیرا، ہائے بشیرا 81

جرمنی

اب ہم فرینکفرٹ میں ہیں 90
ہم جرمن زبان پر بھی حاوی ہو گئے 94
کھانا ہمارا سیب 99
آنا برلن اور ٹھہرنا کفرستان میں 103
برلن۔ ہمارا اور منشی جی کا 113
رائٹ برادران سے رجب علی سرور تک 121

ہالینڈ

کوہ (ہوٹل) البرز کی چوٹی پر 129
ہالینڈ ہم کو پسند آیا 136

www.pakistanipoint.com

ہالینڈ کے راستوں میں تنہا 141
ہمیں بھی آرٹ سے رغبت ہے 150

سوئٹزرلینڈ

ہوٹل ساں ساں ساں 157
کھولنا اکاؤنٹ سوئٹزرلینڈ میں 163
ہم جنیوا سے چل دیے 172
زیورخ تک براستہ بٹھنڈہ 182

پھر پیرس

شامتِ اعمال ماصورتِ پیرس گرفت 194
ڈربی (ہوٹل) کی ریس کون جیتا؟ 200

ویانا

ہم ویانا پہنچتے ہی ڈی ویلیو ہو گئے 208

قاہرہ

دِکھلایئے لے جا کے تجھے مصر کا بازار 218
اہرام کے سایے میں 225
خان خلیل کی ایک شام 232

لبنان وشام

بیروت کی باتیں **240**
دمشق میں عشق **246**
ایک شام ماضی کی محرابوں میں **253**
جونیہ سے طرابلس تک **260**
چل خسرو گھر اپنے **267**

www.pakistanipoint.com

پیرس

۶ ستمبر تا ۱۲ ستمبر ۱۹۶۷

www.pakistanipoint.com

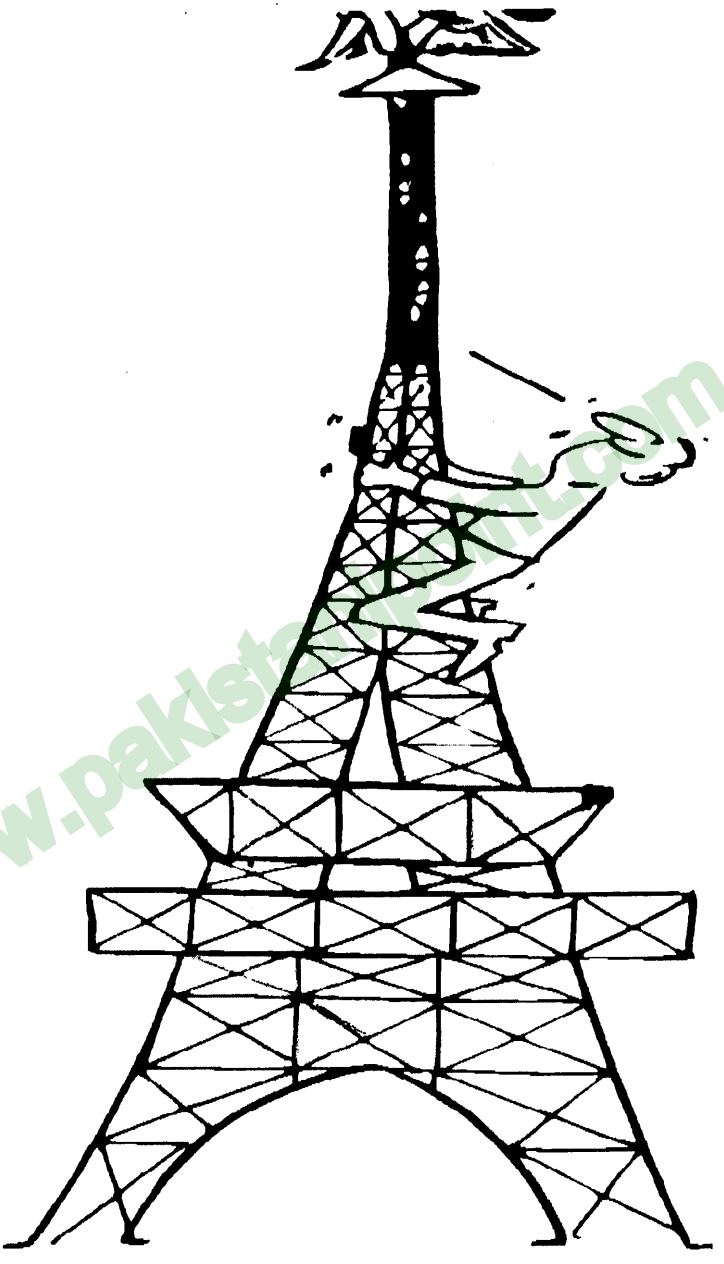

www.pakistanipoint.com

یہ پیرس کا ہوٹل مالا رہے

یہ پیرس کا ہوٹل مالا رہے۔ اس وقت جبکہ ہماری جہاں گردی پر رشک کی نگاہ کرنے والے کراچی میں اپنے خوانوں پر تر لقمے اڑا رہے ہوں گے، یہ آوارۂ کوئے بتاں آوارہ تر بادا پنیر کے بدمزہ اور سخت سینڈوچ کھا کر بیٹھا اور نمک سلیمانی پھانک رہا ہے۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ پیرس جانے والا جاتے ہی پریوں کے جھرمٹ میں گھر جاتا ہے اور اس کا دن عید اور رات شبِ برات ہوتی ہے، انہیں یہ جان کر اطمینان ہونا چاہیے کہ ابھی ہم دن بھر کی گردش کے آبلے پھوڑ کر بیٹھے ہیں، دل کے پھپھولوں کی باری آتی معلوم نہیں ہوتی۔

ہوٹل مالا رکو پیرس کا ملباری ہوٹل کہہ لیجئے تو مضائقہ نہیں۔ وہی ہیبت وہی شوکت وہی شان دلا رائی۔ یہاں ہمیں گھر کا سا آرام میسر ہے۔ اس کے غسل خانے میں ہمارے گھر کی طرح پانی کم کم آتا ہے۔ بلب کی روشنی خاص طور پر اس لئے دھیمی رکھی گئی ہے کہ کوئی راتوں کو پڑھ پڑھ کر اپنی آنکھیں خراب نہ کرے۔ باتھ روم ایسی تنگنائے غزل ہے کہ ہم نے فوارہ کھول تو لیا لیکن بدن پر صابن نہ لگا سکے، کیونکہ ہمارے قارئین میں سے جو صاحبان کبھی نہائے ہیں وہ جانتے ہیں کہ صابن لگانے کے لئے کہنیوں اور گھٹنوں کو حرکت دینی پڑتی ہے اور اس حمام بادگرد کی دیواریں اس قسم کی عیاشی اور خوش فعلی کی گنجائش نہیں رکھتیں۔ ایک اور بات اس ہوٹل میں ہمارے گھر کی سی یہ ہے کہ یہاں کوئی ہماری بات سنتا نہیں۔ سنتا ہے تو سمجھتا نہیں اور سمجھتا ہے تو جواب نہیں دیتا۔

ہمارا یورپ کا یہ پھیرا پورے چھ سال بعد پڑ رہا ہے۔ 1961ء میں یہی دن تھے بلکہ

عجب اتفاق ہے کہ ستمبر کی پانچویں ہی تھی جب ہم نے کراچی سے اڑان کی۔ اس وقت بھی ہم چار روز کو پیرس میں اترے تھے اور پیرس کی دیدنی چیزیں دیکھ لی تھیں لیکن اب تو ان کی یادیں ایک خواب کے سمان ہیں۔ آج شام ہم ایفل ٹاور کی طرف جا نکلے تو پھر آسمان چھونے کو جی مچلا۔ لیکن فقط دوسرے مالے تک جا سکے۔ تیسرا کسی وجہ سے بند تھا۔ 1961ء میں یہ تنہائی کا عذاب نہ تھا۔ ہم دو آدمی تھے۔ خریداری ہر چند کہ اس وقت بھی اسی طرح کرتے تھے کہ انگلی سے اشارہ کیا۔ ''یہ یہ اور وہ۔'' اس کے بعد مٹھی بھر پیسے نکال کر آگے کر دیے کہ لے لو جتنا جی چاہے۔ دو آدمیوں کے ہمہ وقت ساتھ رہنے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ کل ہمارے دوست ہاشم نے کہ سفارت خانے میں پریس اتاشی ہو کر آئے ہیں ہمیں دال بھات کھلا دی تھی لیکن پرسوں رات ہم پر عجب ماجرا گزرا۔ ہوا یہ کہ سید ولی اللہ نے جو چھ سات سال سے پیرس میں ہیں، ہمیں فون کیا کہ کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات۔ میں آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تمہیں ہوٹل سے آلوں گا۔ ہمیں یہ بات کچھ پسند نہ آئی کہ وہ کھانا بھی کھلائیں اور لینے بھی آئیں۔ لہٰذا عذر کر دیا کہ اس وقت ایک اور صاحب نے تکلف کی دعوت کر رکھی ہے۔ وہاں جانا ہے۔ آپ کے ساتھ تو گھر کا سا معاملہ ہے۔ پھر کبھی سہی۔ انہوں نے فرمایا: اچھی بات۔۔۔ میں مجبور نہیں کرتا۔

ہم نے شہر کا نقشہ ہاتھ میں لیا اور شانزالیزے کی راہ پکڑی۔ خاصا لمبا چکر پڑا اور محراب فتح تک پہنچتے پہنچتے کچھ سردی نے اور کچھ بھوک نے لہرا دکھانا شروع کیا۔ شانیزا لیزے پر کہ پیرس کی مال روڈ ہے، ہوٹلوں اور کیفوں کی کمی نہیں۔ ہم نے ایک دو کو ٹھٹک کر دیکھا۔ گائیڈ بک کے حوالے سے معلوم ہوا کہ وہاں ایک وقت کا کھانا ستر سے نوے فرانک تک قیمت پاتا ہے۔ سینڈوچ وغیرہ لئے جا سکتے تھے لیکن ایک تو سُور کے قتلوں کا ڈر دوسرے جہاں نگاہ کی شراب کے شیشے تو ضرور نظر آئے، چائے کافی کا سامان دکھائی نہ دیا۔ یاد رہے کہ یہاں شراب پانی سے سستی ہے۔ سادہ پانی کی بوتل ایک روپے میں آتی ہے۔ شراب کا جام چھ آنے آٹھ آنے میں۔ اپنی جیب کو دیکھتے ہوئے تو ہمیں مے ہی پینی

www.pakistanipoint.com

www.pakistanipoint.com

چاہیے۔لیکن عادت کا کیا کریں:

قرض کا پیتے ہیں پانی، پر سمجھتے ہیں کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

خیر! جی میں یہی ٹھانی کہ محراب فتح سے اپنے گھر کا رُخ کرو اور گلی کے کونے پر جو کیفے ٹیریا ہے، وہاں سینڈوچ کھاؤ، کافی پیو اور پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سو جاؤ۔سو اتفاق سے ہم راستہ بھول کر کہیں کے کہیں جا نکلے اور اپنی گلی تک آتے آتے ساڑھے نو کا عمل ہو گیا۔دیکھا کہ وہ کیفے بند ہے۔دور دور تک اور بھی کوئی دکان کھلی نظر نہ آئی۔چند قدم پر ایک مٹھائی بسکٹوں والے کا اسٹور تھا۔وہ بھی بند نکلا۔ایک نکڑ پر فقط ایک تمباکو سگرٹوں والے کا کیبن کھلا تھا۔لیکن ماکولات میں سے کوئی چیز اس کے پاس بھی نظر نہ آئی۔اب بھوک خوب چمک گئی تھی اور اتنی لمبی کالی رات سامنے تھی۔سوچا کہ ہوٹل کی خادمہ سے کہیں گے کہ بی بی ہمیں ایک کپ کافی بنا دو اور ہو سکے تو ناشتے کے لئے جو ڈبل روٹی آئی ہو گی اس میں سے کچھ مکھن یا جام کے ساتھ عنایت کر دو۔جان و مال کو دعائیں دیں گے لیکن وہ عفیفہ اس وقت برتن اوندھائے ٹیلی ویژن دیکھنے میں مصروف تھی۔ہم نے کچھ دیر توقف کیا کہ پروگرام ختم ہو لے، لیکن وہ تو کوئی لمبا ڈراما چل رہا تھا۔ہم نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لئے سلام بھی کھینچ مارا۔اور یہ بھی کہا کہ ہمارے کمرے کی بتی خراب ہے لیکن اس نے ٹیلی ویژن سے دھیان ہٹائے بغیر وعلیکم السلام کہہ دیا اور یہ کہ بتی کی بات کل دیکھی جائے گی۔

اب ہم پھر اپنے کمرے میں آئے اور کنڈی لگا کر سوچنے لگے کہ کیا کھایا جائے شاید کوئی ٹافی وغیرہ کوٹ کی جیب میں ہو۔نہیں۔کوئی نہیں۔پانی ضرور دھرا ہے، لیکن وہ تو پانی ہے۔ہم اپنے ساتھ کراچی سے اگر کھانے کی کوئی چیز لے کر چلے تھے تو وہ دو شیشیاں کارمینا کی تھیں اور ایک نمک سلیمانی کی۔دو ٹکیاں کارمینا کی کھائیں لیکن وہ سونے پر سہاگہ ہو گیا۔اے کاش حکیم سعید نے بھوک بڑھانے کی بجائے بھوک مٹانے کی گولیاں بنائی ہوتیں۔

اب ہم بستر پر سیدھے بیٹھے ہیں اور سوچ رہے ہیں۔ کب صبح ہو اور ناشتہ ملے۔ لیکن ابھی تو دس بھی نہ بجے تھے۔ آخر یاد آیا کہ پی آئی اے والوں نے چھوٹا سا سونف کا ایک پیکٹ دیا تھا۔ کوئی تولہ بھر سونف اور دو تین دانے اس میں چھالیا کے۔ ڈھونڈنے پر نکل آیا۔ ہم نے اس پر دانت تیز کئے۔ سونف تو بجائے خود اشتہا افزا ہے لیکن چھالیا کام کی چیز نکلی۔ معدے نے درد کی دوا پائی۔ کچھ خلا پانی سے پُرا ہوا اور پیٹ کے الاؤ کو دھیما کر کے ہم بستر میں گھس گئے۔

www.pakistanipoint.com

آنا فائر بریگیڈ کا مرزا نسیم بیگ کے گھر

ہمارے ہوٹل میں کوئی شخص انگریزی جانتا بولتا نہیں۔ یہی حال ہماری فرانسیسی کا ہے کہ رفت گیا اور بود تھا، سے آگے نہیں جاتی۔ پڑھنا تو اس زبان کا ایسا مشکل نہیں، لیکن بولنا؟ فرانسیسی میں سب سے مشکل مرحلہ یہی ہے۔ یہ ظالم لکھتے تو اے سے زیڈ تک سبھی حروف ہیں لیکن بولنے میں ان میں سے دو تہائی کو پی جاتے ہیں۔ پیرس ان کے ہاں پاری ہے اگرچہ بعضے بولنے میں اسے پغیہ بھی بنا دیتے ہیں۔ مشہور سڑک CHAMP ELYSEES کو آپ انگریزی میں شاید پڑھیں گے چیمپ الی سیز، جبکہ یہ ہے شانزالیزے۔ جس کے سر راہ کیفوں میں سنا ہے جمیل الدین عالی گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے اور دوہوں کے لیے مضمون اکٹھے کرتے تھے۔ ہماری مرغوب سڑک انگریزی کے قاعدے سے بولوارڈ سینٹ مائیکل ہونی چاہیے۔ Boulva St Michel لیکن فرانسیسیوں کے نزدیک بلوار سال مثال ہے ہم متیرو یعنی زمین دوز ریل میں سفر کرتے ہیں۔ ہمارا بتایا ہوا سٹیشن کا نام کبھی کسی کی سمجھ میں نہ آیا نہ کسی کا بتایا ہوا ہماری سمجھ میں آیا۔ لکھ کے بتاتے ہیں تو مخاطب کہتا ہے۔ ''اچھا

یا رب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات

یہ مطلب ہے، تو میاں یوں کہو نا۔'' تھک ہار کے ہم نے زبان کا ٹنٹا ہی ختم کر دیا ہے ممکن نہیں کہ شیخ امرا القیس بنیں۔ پنڈت جی بالمیک ہونے کے نہیں۔ رستہ پوچھیں تو مہربان فرانسیسی آدھا گھنٹہ تک غوں غاں کرتا ہے۔ اور اپنی طرف سے وضاحت سے سمجھاتا ہے

یارب نہ ہو سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات

لیکن ہمارے کام کی چیز فقط اس کی انگلی کا اشارہ ہوتا ہے ہم نے بھی اب اشاروں کی زبان پر ایسا عبور حاصل کر لیا ہے کہ رازی کے نکتہ ہائے دقیق تک ان میں بیان کر سکتے ہیں لیکن کبھی کبھی اشارہ بھی رنجک چاٹ جاتا ہے ہم کل نیچے میترو کے پلیٹ فارم پر پہنچ کر ایک صاحبِ دل فرانسیسی سے پوچھ بیٹھے کہ کیمبروں کا سٹیشن جہاں ہمیں جانا ہے (انگلی سے اشارہ کر کے) اِدھر ہے یا اُدھر ہے؟ ایسا اکثر ہوا کہ ہمیں جانا مشرق کو ہے اور پہنچ گئے مغرب میں۔ اُس بھلے مانس نے ہمارے بار بار کے استفسار کے جواب میں اپنی انگلی سے برابر نیچے ہی اشارہ کیا، کہ اِدھر نہ اُدھر بلکہ گاڑی یہیں آئے گی۔ ہم عاجز آ کر وہاں سے کھسکنے لگے تو ہمیں پکڑ کر کھڑا ہو گیا، اور زبردستی اس گاڑی میں بٹھایا جو الٹی طرف کو جاتی تھی۔

ہمارے دوست ہاشم نے کہ فرانس میں تازہ وارِدِ بساط ہوائے دل ہیں یہ نسخہ دریافت کیا کہ منہ پورا کھول کر آواز نکالو، تب صحیح فرانسیسی لہجہ برآمد ہو گا لیکن خود ان کے ساتھ یہ گزر چکی ہے کہ ایک ریستوران میں انہوں نے کسی چیز کا آرڈر دیا جو تین فرانک کی تھی۔ بیرا اس

www.pakistanipoint.com

نام سے ملتی جلتی دوسری چیز لے آیا جس کے انہیں اکیس فرانک دینے پڑے۔ ممکن ہے انہوں نے منہ پورے سے کم کھولا ہو یا زیادہ کھول دیا ہو۔ بہر حال اب ان کا کہنا ہے کہ جب تک پوری طرح فرانسیسی پر عبور نہ حاصل کرلوں، کم از کم خریداری میں فرانسیسی استعمال نہ کروں گا۔ ان کی یہ احتیاط عین دانشمندی ہے۔ ایک دوست ہمارے انہی کے سے تیراکی کا شوق رکھتے تھے۔ لیکن کہتے تھے کہ جب تک اچھی طرح تیرنا نہ سیکھ جاؤں پانی میں نہیں اتروں گا۔ چنانچہ نہیں اترے۔

جب ہم رات کو گھر یعنی ہوٹل کے کمرے میں آتے ہیں تو کونٹر پر جو صاحبہ ہیں ہمیں ضرور کچھ نہ کچھ (فرانسیسی میں) بتاتی ہیں کہ یہ فون آیا تھا، یہ پیغام ہے۔ ہم شکریہ ادا کر کے اوپر آجاتے ہیں۔ انہوں نے پیغام دے دیا۔ ہم نے سن لیا۔ الاعمال بالنیات۔

ہمارے دوست مرزا نسیم بیگ یونیسکو میں تیرہ برس سے ہیں اور فرانسیسی فرفر بولتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ تم پر کیا گزرے گی جو مجھ پر شروع کے ایام میں گزری۔ ہم نے کہا۔ ارشاد! تب انہوں نے بیان کیا کہ میں نے مکان لیا تو گھر کے کام صفائی وغیرہ کے لیے نوکرانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہاں کے نوکر بھی نواب ہوتے ہیں۔ لیکن بہر حال کسی نے بتایا کہ گلی کے کونے پر جو تمبا کو فروش کی دکان ہے وہاں اپنا نام پتہ دے دو۔ ان کے پاس کوئی کام کی متلاشی آئے گی تو تمہارے پاس بھیج دیں گے۔ پس مرزا صاحب نے اپنی غوں غاں کر کے تمبا کو فروش کو فرمائش نوٹ کرادی اور اپنا پتہ دے دیا۔ آگے ان کی زبانی سن لیجئے۔

''تیسرے روز کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے کھولا تو دیکھا کہ ایک خاتون کھڑی ہیں۔ اچھی خاصی معزز۔ لیکن کام کے اوقات کے باہر تو ہر کوئی شان کا لباس پہنتا ہے۔ کنجڑے قصائی تک سوٹ پہن کر صاحب بہادر بن جاتے ہیں۔ میں نے انہیں عزت آدر سے بٹھایا۔ گفتگو شروع ہوئی، انگریزی میں:

www.pakistanipoint.com

Speak English? (انگریزی بولتے ہو؟) محترمہ نے پوچھا۔

Yes Speak English. (ہاں بولتا ہوں) میں نے کہا

Work (کام؟)

Yes Work. (ہاں کام)

''کتنے گھنٹے؟''

''یہی چار پانچ گھنٹے''

''تنخواہ؟'' ان محترمہ نے سوال کیا۔

''وہی جو عام طور پر ہوتی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہفتہ اتوار چھٹی؟''

''ہاں ہفتہ اتوار چھٹی''

''کب سے کام شروع کرنا ہے؟''

''جب سے آپ کا جی چاہے''

''آج ہی سے شروع ہو سکتا ہے؟''

ان محترمہ نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور اس پر اپنا پتہ لکھ کر کہا ''یہ لو اس پتے پر آ جانا۔''

تب جا کر بھید کھلا کہ وہ محترمہ خود ایک نوکر کی تلاش میں تھیں۔ تمباکو فروش نے بتایا ہوگا کہ ایک صاحب آئے تھے۔ کسی کام کی تلاش میں ہیں، یہ رہا ان کا پتہ۔ وہ بیچاری نوکر کے لیے ترسی ہوئی خود میرے غریب خانے پر پہنچ گئیں۔

دوسرا واقعہ جو مرزا نسیم بیگ کے ساتھ گزرا، نسبتاً زیادہ سنگین تھا۔ ان دنوں یہ 95 وکٹر ہیوگو ایونیو پر رہتے تھے۔ ایک روز شام بیگم کے ساتھ باہر نکلے تو چابی اندر ہی بھول گئے۔ دروازہ اس قسم کا تھا جو بند تو خود بخود ہو جاتے ہیں لیکن کھلتے چابی سے ہیں۔ واپسی رات کے

www.pakistanipoint.com

گیارہ ساڑھے گیارہ بجے ہوئی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو چابی ندارد۔ کریں تو کیا کریں۔ نیچے ڈیوڑھی میں ایک بڑی بی رہتی تھیں۔ ان سے عرضِ حال کیا۔ وہ تھوڑی بہت انگریزی جانتی تھیں سمجھ گئیں اور ان کو مشورہ دیا کہ فائر بریگیڈ کے دفتر جاؤ ان کے پاس لمبی سیڑھیاں ہوتی ہیں، ان کی مدد سے کوئی شخص باورچی خانے کے روشندان میں سے گھس کر اندر سے کنڈی کھول دے گا۔ آسان سی بات ہے''۔

فائر بریگیڈ کا دفتر پچھواڑے ہی میں تھا، انہوں نے وہاں جا کر مافی الضمیر سمجھانے کی کوشش کی۔ ایک دو لفظ فرنچ کے، کچھ انگریزی، باقی اشارے۔ وضاحت کے لیے چٹ پر گھر کا پتہ لکھا۔ ''95 وکٹر ہیوگو ایونیو''۔ داروغہ صاحب نے اسے دیکھتے ہی سیٹی دی اور ایک بٹن دبایا۔ پھاٹک خود بخود کھل گیا اور دو فائر بریگیڈ کے انجن باہر نکل پڑے، فائر مین پہلی منزل پر چوکس بیٹھے تھے، ان کو حکم رہتا ہے کہ سیڑھی یا لفٹ کا انتظار مت کرو، جونہی حکم ملے پانی کے پائپ سے پھسل کر نیچے آ جاؤ۔ چنانچہ ایک کے بعد ایک نے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ مرزا صاحب کو صورت حال کا احساس ہوا بھاگے بھاگے ان کے پاس گئے ان کو ہاتھ کے اشارے سے روکا لیکن جس کو روکتے وہ ان کا ہاتھ ایک طرف ہٹا دیتا تھا اور کہتا '' 95 وکٹر ہیوگو ایونیو''۔ یعنی یہ کہ تمہارے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں گھر کا پتہ معلوم ہے۔ دیکھتے دیکھتے وہ انجنوں پر سوار، گھنٹیاں گھنٹے بجاتے روانہ ہو گئے۔ ان کے شور سے سارے محلے میں جاگ ہو گئی اور لوگ چونک کر کھڑکیوں میں سے جھانکنے لگے کہ کیا اُفتاد آن پڑی۔ بعضوں نے فائر بریگیڈ دیکھ کر فرض کر لیا کہ یہ آگ لگی ہے اور شور مچانا اور دھڑا دھڑ باہر چھلانگیں لگانا شروع کر دیا۔ ایک فائر مین نے ان کے فلیٹ کی کھڑکیوں پر پانی تڑیڑا بھی دینا شروع کیا اور دوسرا کلہاڑا لے کر اوپر چڑھ گیا لیکن آگ نہ دھواں، کچھ ہوتا تو نظر آتا۔ ہجوم میں ایک صاحب انگریزی دان بھی تھے، ان کو مرزا صاحب نے بتایا کہ چابی

www.pakistanipoint.com

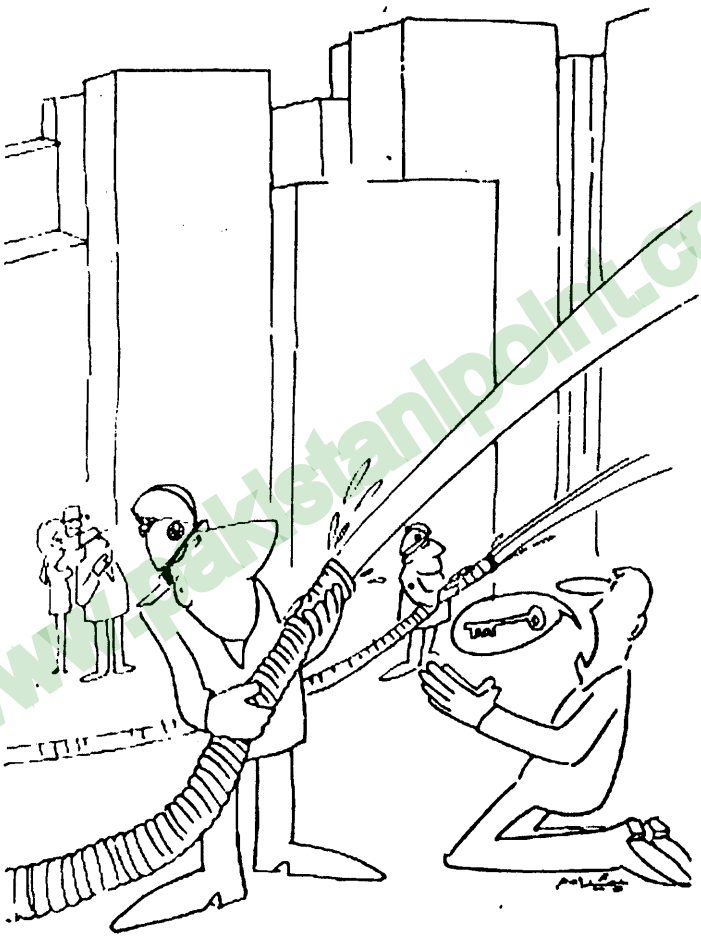

www.pakistanipoint.com

اندر رہ گئی ہے فقط اس کو نکالنا ہے۔ للہ ان سے کہیے کہ اتنے کھڑاگ کی ضرورت نہیں۔ فقط ایک آدمی اندر گھس کر دروازہ کھول دے بڑی مہربانی ہوگی۔ وہ لوگ بکتے جھکتے چلے گئے اور رپورٹ کی کہ ان صاحب کے ہاں تھا کیا جسے آگ لگتی۔ ناحق غلط اطلاع دے کر ہمارے کام کا نقصان کیا ہے۔ ان سے ہرجانہ لیا جائے۔ بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا۔

ہماری گلی کے سرے پر ایک بہت پرانی بلڈنگ تھی، اٹھارویں صدی کے اوائل کی۔ کسی امیر کی حویلی رہی ہوگی۔ اس کے پھاٹک پر ایک بورڈ ہم نے دیکھا SORTIE DE VOTTRES ہم نے جی ہی جی میں فرانس والوں کی تعریف کی کہ اپنی تاریخی عمارتوں کا کتنا خیال کرتے ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ نے بورڈ لگا دیا ہے کہ کوئی اسے گزند نہ پہنچائے۔ اس گلی میں آگے جا کر ایک اور عمارت کے پھاٹک پر یہی لکھا دیکھا۔ وہ بھی پرانی تھی لیکن اتنی زیادہ نہیں۔ گویا محکمہ آثار قدیمہ نے تہیہ کر لیا ہے کہ پیرس کی عمارتوں کی پرانی شان برقرار رکھی جائے۔ لیکن بڑی سڑک پر ہم مڑے تو ایک بالکل نئی عمارت کے ماتھے پر یہ بورڈ دیکھا۔ اب ہم چکنم میں پڑ گئے کہ اس سے آثار قدیمہ والوں کا کیا تعلق؟ آخر ایک صاحب سے پوچھا۔ وہ بہت ہنسے اور کہنے لگے یہ تو ہر دوسرے گھر کے پھاٹک پر لکھا ملے گا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہاں سے موٹر نکلے گی۔ کوئی صاحب اپنی گاڑی سامنے کھڑی کر کے راستہ بند نہ کریں۔

ایک اور نوٹس ایک دیوار پر نظر آیا DEFENCE D, AFFICHER آخری لفظ کا مطلب تو ہوا افریقہ اور ڈیفنس کا مطلب سب جانتے ہیں۔ ہمیں یاد آیا کہ الجزائر کی جنگ کے دنوں میں فرانسیسیوں کا جن سنگھی طبقہ اس بات کے لیے مظاہرے کر رہا تھا کہ افریقہ کی حفاظت کرو یعنی حریت پسندوں کی شورش کو دباؤ۔ افریقہ پر اپنا قبضہ برقرار رکھو۔ یہ نعرہ جو جا بجا ہر سڑک پر لکھا نظر آیا تو ایک فرنچ دان دوست کے سامنے ہم نے سامراجی فرانسیسیوں کی ذہنیت کا ماتم کیا۔ اس نے کہا تمہارا جذبہ قابلِ تعریف ہے لیکن اس فقرے کا

www.pakistanipoint.com

مطلب ہے ''یہاں اشتہار لگانا منع ہے'' شانزالیزے پر ایک جگہ بہت سی چمکیلی کاریں کھڑی نظر آئیں۔ اوپر موٹے لفظوں میں لکھا تھا OCCASIONS۔ ہم حیران کہ اس لفظ کے استعمال کا یہ کونسا موقع ہے۔ کئی دن کے بعد بھید کھلا کہ اس کا مطلب ہے سیکنڈ ہینڈ۔ وہ ساری موٹریں سیکنڈ ہینڈ تھیں اور برائے فروخت تھیں۔ دمِ تحریر ہماری زبان دانی کی زینبل میں بوں ژور (صبح بخیر بلکہ دن بخیر) کے علاوہ جو الفاظ ہیں ان میں ایک SORTIE بھی ہے کیونکہ یہ ہر جگہ ہر عمارت میں زمین دوز ریلوے کے سٹیشنوں، پر سینماؤں میں، عجائب گھروں میں لکھا رہتا ہے۔ اس کا مطلب ہے EXIT یعنی باہر جانے کا راستہ۔ ہاشم نے کہا اسے مت بھولنا۔ بڑے کام کا لفظ ہے۔ کوئی افتاد آن پڑے تو کم از کم یہ تو جان لو گے کہ کدھر کو بھاگنا ہے اور واقعی ہم SORTIE کے نشانوں کے ساتھ ساتھ چلتے ایک جگہ دم لینے کو رُکے بلکہ روکے گئے تب پتہ چلا کہ ہم فرانس کی حدود سے باہر آ گئے ہیں۔ ایک انگریز سارجنٹ ہمارا شانہ ہلا کر کہہ رہا تھا NO ENTRY پہلے اپنا پاسپورٹ دکھاؤ، میاں جی۔

www.pakistanipoint.com

www.pakistanipoint.com

متفرقاتِ پیرس

پیرس میں جس روز ہم اترے، اسی روز جاڑے نے نزولِ اجلال کیا۔ جانے کس نے ۱۰م کو خبر کر دی تھی کہ ایک غریب الدّیار ہلکا سوٹ پہن کر گھر سے نکلا ہے۔ خیمہ وخرگاہ بھی نہیں رکھتا۔ اس عروس البلاد میں بلانے والے اسے چالیس فرانک (روپے) روزانہ دیں گے اور بھوکا ماریں گے کیونکہ اتنا تو اس کے ہوٹل کا کرایہ ہی ہے۔ مے نہ پیتا ہے نہ پینے کی استطاعت رکھتا ہے۔ پہلو میں دل گرم ضرور ہے بلکہ یوں کہیے کہ کبھی تھا کیونکہ وہ بھی لوگوں کی سرد مہریوں کے تھپیڑے کھا کھا کر شیر گرم رہ گیا ہے۔ بقول انگلستان کے آغا حشر، ولیم شیکسپیئر کے:

چل اے ہوائے زمستاں چل اور زور سے چل
تُو سرد مہریٔ احباب سے زیادہ نہیں

کہہ نہیں سکتے کہ پیرس کی کس بات پر ہمارا دل آیا۔ خوباں تو یہاں کے جیسے بھی ہوں لیکن ہمیں سین کے ساحلوں کی آوارہ گردی، پرانی کتابوں، نقشوں اور تصویروں کی سیرِ دریا، دکانوں کے ذخیرے اور شاہراہ ساں مشال MICHAEL.ST کا ماحول خاص طور پر بھائے۔ درسگاہوں کا ماحول ہم آپ جانتے ہیں کہ کیسا ہوتا ہے، جورِ استاد۔ سخت گیر وارڈن..... آپ منچلے ہیں تو اونچی دیواریں پھاندیئے۔ کمندیں پھینکئے ورنہ .....
لیکن سوربون کے طالب علموں کو فرانس کی روایات آزادی سے حصہ وافر ملا ہے۔ ان طالب علموں
میں گورے بھی ہیں کالے بھی۔ دیوارِ رنگ جو برطانیہ میں کم کم اور امریکہ میں بہت اونچی

اٹھ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجئے

ہے۔ فرانس میں وجود نہیں رکھتی۔ کالوں کو دیکھا کہ شکلیں تو ہم ایسی لیکن نصیبے سکندری۔ ہر زاغ کی چونچ میں ایک ایک دو دو انگور۔ جوانی کی راتیں مرادوں کے دن۔ اے میاں کیوں اتنی دیر کر کے آئے۔ اب ہمیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر۔ یہاں کے لوگ بھی طالب علموں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ اگر کسی ڈرامے یا شو کا ٹکٹ دس یا بیس فرانک ہے تو طالب علم کا ایک فرانک بھی بہت جانا جاتا ہے۔ یہ بچارے بھی قلندرانہ زندگی کے عادی ہیں۔ کوچہ ساں مثال کے دو روپیہ سستے کیفوں کی قطاریں ہیں۔ طالب علموں کے غول باہر لگے ہوئے مینو پڑھ کر کم خرچ کھانوں کا انتخاب کرتے ہیں، بلکہ زیادہ تر تو چمچے اور پلیٹ کے جھنجٹ میں نہیں پڑتے۔ ہاتھ میں سینڈوچ ہے۔ جب ذرا گردن جھکائی کھا لیا۔

www.pakistanipoint.com

اس آزادی اور شانِ قلندری کی توقع لندن، آکسفورڈ یا کیمبرج کے طالب علم سے نہ رکھئے۔

حسن کی شوخیاں اور عشق کی گرمیاں یورپ کے لئے نئی بات نہیں۔ اب تو پردے پر پردا اٹھ رہا ہے۔ لیکن اتنا ہم کہیں گے کہ پیرس میں لندن کا سا ابتذال نہیں۔ لندن میں تو سیدھی سادھی جسم فروشی ہوتی ہے۔ پیرس میں لب و کنار کی دعوتیں ضرور ہوتی ہیں:

چھاتی سے لگا چوم لیا، ہو گئے چپکے

لیکن غنڈہ گردی اور بیسوا پن نہیں۔ عاشقی بھی سلیقے کی اور فاسقی بھی سلیقے کی۔ اُدھر ہمارے پیرس سے جانے کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ یعنی گاؤں کنارے باجا باجے، لندن دیس بسانا ہوگا۔ اُدھر پیرس سے محبت بڑھتی جا رہی ہے:

خود بخود دل میں ہے یہ شہر سمایا جاتا

شہر تو ہم نے اور بھی دیکھے ہیں لیکن جو بات پیرس کی ہے وہ اور کہاں۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر

زبان نہیں آتی۔ بھلے سے نہ آئے۔ آخر گزارہ چل ہی رہا ہے۔ چھ سال پہلے ہم نے پیرس قطعی مسافرانہ یعنی سیاحانہ دیکھا تھا۔ ایک ٹورسٹ بس میں بیٹھ گئے تھے اور اس نے شہر میں گھما دیا تھا کہ یہ نپولین کا مقبرہ ہے۔ یہ محراب فتح ہے۔ یہ نوتری ڈیم کا گرجا ہے اور وہ لوور کے در و دیوار ہیں۔ دور سے دیکھ لو۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ یہ تو کچھ دیکھنا نہ ہوا۔ اس بار ہم نے اپنے شوق کو رہبر بنایا اور اپنی ٹانگوں کی سواری پسند کی۔ نوتری ڈیم یا نوتری دامے کو جی بھر کے فرصت سے دیکھا۔ مذہبی سروس میں بھی پچھلی بنچوں پر بیٹھے اور اس کی عظمت و جبروت کا نقشِ دل پر لے کر اٹھے۔ پیرس میں یہ سب سے محترم عبادت گاہ ہے لیکن ہم تو اسے وکٹر ہیوگو اور اس کے ناول ''نوتری ڈیم کا کبڑا'' کے حوالے سے جانتے ہیں۔ یہاں ایک زمانے میں جیوپیٹر کا مندر ہوا کرتا تھا۔ اس کی جگہ بارہویں اور چودھویں صدی عیسوی کے درمیان یہ گرجا تعمیر ہوا۔ ذرا اس کی رفعت کو دیکھئے اور وسعت کو دیکھئے۔ اس کی پیشانی کے مجسموں کو دیکھئے۔ اس کی رنگین منقش کھڑکیوں کو دیکھیے، بلند و بالا ستونوں

www.pakistanipoint.com

اور مخروطی چھت کی زیبائش پر نظر کیجیے۔ جانے کتنے برس اس کام میں لگے ہوں گے۔

فرانسیسی لوگ اپنی زبان پر ایسا فخر کرتے ہیں کہ شاذ و نادر ہی کہیں انگریزی کا کوئی نوٹس لیتا ہے لیکن نوٹرے ڈیم کے دروازے کے پاس جو نوٹس ہے وہ انگریزی میں ہے۔

''یہ میوزیم نہیں ہے۔ خانہِ خدا ہے۔ یہاں ڈھنگ کا لباس پہن کر آؤ۔ اسے کھیل کا میدان یا ساحلِ بحر مت تصور کرو کہ کچھ پہنا پہنا نہ پہنا نہ پہنا۔''

لہجے سے پتہ چل جاتا ہے کہ خطاب دنیا کی سب سے امیر لیکن نو دولتی قوم امریکہ سے ہے۔ یا پھر ایک تحریر ایونیو بوسکے کی ایک دیوار پر انگریزی میں نظر آئی۔

U. S GO HOME

www.pakistanipoint.com

ٹورسٹ کا مطلب ہے امریکن ٹورسٹ

www.pdfbooksfree.pk

لندن

13 ستمبر تا 11 اکتوبر 1967ء

www.pakistanipoint.com

لندن سے ایک خط

عالی میاں!

یہ لندن ہے اور لندن میں مسز واٹسن کا بھٹیار خانہ موسوم بہ گلوسٹر ہوٹل۔ اس وقت میں کمرہ نمبر 17 سے جو تہہ خانے میں سڑک کے رخ واقع ہے اور جس کی کھڑکی کے باہر کوڑے کا ڈرم نظر آ رہا ہے، یہ نامہ شوق آپ کی خدمت میں لکھ رہا ہوں۔ میر باقر علی داستاں گو نے کسی غریب مسافر کے سرائے میں جانے اور بھٹیارنوں سے پالا پڑنے کا حال اپنی داستانی بولی میں لکھا ہے، اس وقت یاد آ گیا لیکن نہیں۔ یہاں اتنی زدہ کیفیت بھی نہیں۔ ہاتھی لٹے گا بھی تو کہاں تک۔ یہ سچ ہے کہ وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں۔ یعنی یہ کمرہ وہ نہیں جس کی بکنگ میں نے کراچی ہی سے خط لکھ کر کرالی تھی۔ بے صبر مسز واٹسن نے وہ کسی اور گاہک کو دے دیا اور دیکھا مجھے تو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ۔ یعنی میرا منہ تکنے لگیں کہ آپ تو سچ مچ آ گئے۔ میں نے کہا ہم بارِ خاطر ہوں تو کہیں اور ٹھکانا کریں، شب باشی کا بہانہ کریں سوچ کر بولیں: اجی نہیں ٹھہریئے کوئی بندوبست کرتی ہوں۔ میری خاطر ان کو اتنی منظور ہوئی کہ اس کمرے سے نوکرانی میری کولات مار کر نکال دیا۔ میں نے کہا..... یہ کیا کیا؟ اس بچاری کو کیوں نکالا مجھے کہیں اور جگہ مل جائے گی۔ بولی: اجی صاحب آپ پروانہ کیجئے۔

رقیق القلب نہ بنئیے آپ میرے لئے زیادہ اہم ہیں۔ بزنس از بزنس، اس کا کیا ہے، چند دن میں دھکے کھا کر پھر آ جائے گی۔ کئی بار جا چکی ہے اور آ چکی ہے۔ ہاں تو لایئے ایک ہفتہ کا کرایہ پیشگی۔ آٹھ پونڈ۔'' آپ نے لندن میں ایشیائیوں سے نسلی امتیاز برتے جانے

www.pakistanipoint.com

کی داستانیں سنی ہوں گی اور خبریں دیکھی ہوں گی لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ مسز واٹسن نے میری خاطر اپنی ایک ہموطن کو چلتا کیا۔۔۔ ہاں آٹھ پونڈ کی بات البتہ ہے۔ رنگ و نسل اپنی جگہ، پیسہ اپنی جگہ۔

لندن بالکل ویسا ہی ہے جیسا میں چھ سال پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ اتفاقات سنو کہ 1961ء میں بھی 5 ستمبر کو چل کر 12 ستمبر کو وارِدِلندن ہوا تھا۔ اب کے بھی 5 ستمبر کو چلا اور ایک ہفتہ راستے میں گزار کر 12 ستمبر کو یہاں پہنچا۔ اس سال بھی ان تاریخوں کو منگل کا دن پڑتا تھا۔ اب کے بھی منگل ہی کا ساتھ ہے۔ پیرس میں مالا رہوٹل میں میرے کمرے کا نمبر 17 ہے۔ یہاں میں شام کے جھٹ پٹے میں پہنچا لیکن ہر چیز کچھ مانوس مانوس معلوم ہوئی۔ صبح دم دیکھتا ہوں کہ یہ تو کونیز گارڈن کے بالکل ساتھ والی گلی ہے۔ کونیز گارڈن وہ جگہ ہے جہاں میں اس سال ٹھہرا تھا۔ فقط ٹھہرا ہی نہیں تھا۔ حضرت نوح ناروی کے مصرع کی پوری واردات ہوئی تھی:

کہ اُس نے بلایا، بلا کر بٹھایا، بٹھا کر اٹھایا، اٹھا کر نکالا

آپ کو یاد ہوگا اس سال میرے ساتھ اپنے بنگالی شاعر ابوالحسین بھی تھے۔ ہم دو تو بلجیم کا میلہ بھگتا کر یہاں آئے اور سید اطہر علی کی مہربانی سے کونیز گارڈن کے نمبر 50 میں 3 نمبر کا کمرہ مل گیا تھا۔ ہمارا پروگرام لندن میں فقط آٹھ دس روز رکنے کا تھا لیکن ہوتے ہوتے پانچ ہفتے گزر گئے حتیٰ کہ یار آشنا پوچھنے لگے کہ میاں ابھی گئے نہیں؟ کب جاؤ گے؟ بی بی سی کے دوستوں نے ہم سے تقریریں لکھوانا اور نظمیں پڑھوانا بھی بند کر دیا۔ لندن میں دیکھنے کے مقامات بھی ختم ہو گئے۔ ہمارا غیر ملکی زرمبادلہ کا توازن بھی خاصہ بگڑ گیا تھا اور ہمارے مالک مکان نے بھی مصنوعی اخلاص اخلاص برتنا موقوف کر دیا تھا۔ اس کے باوجود ہم لندن میں تھے۔ محض ابوالحسین صاحب کی پراسرار بیماری کی وجہ سے۔

ابوالحسین نے لندن پہنچتے ہی ڈاکٹروں اور ہسپتالوں کے پتے پوچھنے شروع کر دیئے تھے۔ ایک روز ہم نے گفتگو میں ڈاکٹر گراہم بیلی کا ذکر کیا تو بولے، کس چیز کا ڈاکٹر ہے۔

www.bekitaniparti.com

مجھے اس کے پاس لے چلو نا، ہم نے کہا اول تو وہ لسانیات کا ڈاکٹر ہے اور تمہاری بیماری اس سے مختلف معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے بقید حیات نہیں ہے۔ اس پر انہوں نے دوسرے دوستوں سے رجوع کرنا شروع کیا۔ خصوصاً لندن میں رہنے والے بنگالیوں سے۔ ہمیں نہ ان کے مرض کی نوعیت معلوم تھی نہ ہم نے اس کے متعلق استفسار کرنا مناسب جانا تھا کہ جانے کونسی اور کیسی بیماری ہو جس کے ذکر سے وہ آپ بھی شرمسار ہوں، اور ہمیں بھی شرمسار کریں۔ لیکن جب آٹھ روز گزر گئے اور ہم نے لندن سے آگے چلنے کو کہا تو ابوالحسین بولے: میاں تم چاہو تو جاؤ، میں چند دن اور لندن میں رہوں گا۔ علاج کرا کے جاؤں گا۔

آخر ہم نے معافی چاہ کر پوچھ ہی لیا، کہ مرض ہے کیا؟

بولے: یہ پرانا مرض ہے۔ پاکستان میں اس کا بہت علاج کرا چکا ہوں لیکن نہیں جاتا۔ پاکستان کے ڈاکٹر۔ حکیم، وید، ایلو پیتھیے، ہومیو پیتھیے، فٹ پاتھیے سب دیکھ لئے ہیں تو لندن آیا اسی کارن ہوں۔ شاعری کا حیلہ تو بہانا تھا۔

ہم نے کہا: ''کچھ مرض کی تفصیل تو بیان ہو''

بولے: جس روز دفتر میں مجھے آٹھ دس گھنٹے مسلسل کرسی پر بیٹھنا پڑے تو پیٹھ میں درد ہونے لگتا ہے۔

''معمولی یا شدید؟''

''نہیں شدید تو نہیں ہوتا۔ میٹھا میٹھا، ہلکا ہلکا''

''اور وہ مستقل رہتا ہے؟''

''نہیں۔ پانچ سات منٹ میں جاتا رہتا ہے''۔

''ہر روز ہو جاتا ہے؟''

''نہیں، بلکہ جس روز آٹھ دس گھنٹے مسلسل بیٹھنا پڑے''۔

ہم نے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔ بہت سنگین مرض معلوم ہوتا ہے۔ جم کے علاج کراؤ۔ مالش کرائی ہے؟

www.pakistanipoint.com

www.pakistanipoint.com

کرائی۔

جوشاندہ پیا؟

''پیا''

''ٹیکے لگوائے؟''

''لگوائے''۔

طاقت کی دوائیں کھائیں؟

''کھائیں''

''گنڈے تعویذ کیے؟''

''کیے''

آپریشن کرایا؟

کس چیز کا؟

دماغ کا۔اور کس کا؟ بھلے مانس کیوں ڈاکٹروں کو پریشان کرتے ہو۔لقمان کے پاس گئے ہوتے لیکن تمہارے مرض کی دوا شاید اس کے پاس بھی نہ ہو۔ یہ مرض لاعلاج ہے۔ اب اپنی زندگی کے باقی دن جوں توں پورے کرو۔

ابوالحسین صاحب نے تو نہایت وسیع القلبی سے اجازت دیدی کہ تم چاہو تو جاؤ لیکن یورپ کے کئی ملکوں کا پروگرام باقی تھا اور تنہا آدمی سفر میں زچ ہو جاتا ہے۔دو ہوں تو آپس میں دکھ سکھ سہ لیتے ہیں ایک کمرہ لے لینا سستا پڑتا ہے۔سواری بھی جیسے ایک نے لی، دو نے لے لی۔کئی بار ایک کو سامان کے پاس چھوڑ کر دوسرے کو کوئی اور امر دیکھنا ہوتا ہے۔ بہر حال پردیس میں ساتھی بہت غنیمت ہے خواہ وہ ابوالحسین کا ساہی کیوں نہ ہو۔

آخر یہی سوچا کہ جن لوگوں سے رخصت ہو آئے ہیں کہ بھیا کل جا رہا ہوں۔ان کے سامنے نہ جائیں گے اور لندن کے گلی کوچوں کا گشت جاری رکھیں گے۔

خیر تو اب قصہ خلد سے آدم کے نکلنے کا سنیے۔

www.pakistanipoint.com

وہ رات بڑی سہانی رات تھی۔ ابوالحسین اس روز اپنے ایک دوست کے ہاں مدعو تھے اور انہیں سونا بھی وہیں تھا۔ ہم نے مزے مزے سے ڈھائی شلنگ والا سینما دیکھا اور زمین دوز ریل پکڑ کوئنز وے اسٹیشن پر نکل آئے۔ بھوک لگ رہی تھی۔ کسی اور کھانے کا اس وقت سوال نہ تھا۔ کوئنز وے کے ایک کونے سے دمپی لے لی۔ کراچی میں ریو سینما کے آگے اور دیگر مقامات پر بھی آپ دیکھیں گے کہ بھینس کے موٹے قیمے کے شامی کباب تلنے والے بیٹھے رہتے ہیں۔ آپ پہنچے، انہوں نے ایک چھوٹی ڈبل روٹی یعنی بن کا پیٹ چاک کیا، اس میں ایک کباب مع تھوڑے پیاز چٹنی کے رکھا اور آپ کو تھمایا، یہاں خدا جانے اس کا کیا نام ہے۔ لندن میں ہوتو وومپی نام پائے اور دو ڈھائی روپے میں بکے، خیر وومپی لے، سامنے کی خودکار مشین میں چھ پنس ڈال دودھ کا ٹھنڈا گلاس برآمد کیا اور ایک ہاتھ میں یہ ایک میں وہ لے، کچھ گنگناتے سیٹی بجاتے، گھر کا رُخ کیا۔

پاسبان دروازے کے باہر ہی کھڑا تھا، اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ ہم نے تیور سے پہچانا کہ سلام کر رہا ہے، خیریت پوچھ رہا ہے۔ لہٰذا نہایت خوش دلی سے اس کی بھی خیریت پوچھی اور موسم کی خوشگواری سے بھی مطلع کیا، لیکن اندر سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے یک دم کو ٹھٹکے، وہاں ایک اوورکوٹ زمین پر پڑا تھا، بالکل ہمارے اوورکوٹ کا ہم شکل۔ غور سے دیکھا تو ایک سوٹ کیس نظر آیا۔ یہ بھی اتفاق سے عین ہمارے سوٹ کیس کے ناک نقشے کا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک تھیلا ابوالحسین کے تھیلے کے مشابہ نظر آیا اور کتابوں کا ایک ڈھیر۔ اتفاق کہیے کہ ان کتابوں میں سے بھی سبھی ہمارے پاس اوپر کمرے میں موجود تھیں، قمیضیں ٹائیاں وغیرہ بھی ایک دوسرے پر ڈھیر، لیکن ہمارے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ ادھر توجہ دیتے اور یوں بھی ان چیزوں سے ہمارا کیا تعلق تھا۔ خیر ہم اوپر کمرہ نمبر 3 یعنی اپنے غریب خانے پر پہنچے۔ اور دروازے میں کنجی گھمائی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک صاحب کھڑے ہیں سلیپنگ سوٹ پہنے درشتی سے بولے:

''کیا چاہتے ہو؟

www.pakistanipoint.com

ہم نے کہا: یہ ہمارا کمرہ ہے، آپ یہاں کہاں؟''

انہوں نے کہا: یہ آج سے ہمارا ہے، ہم نے کرایہ دیا ہے، پوچھ لو پاسبان سے۔

اتنے میں پاسبان بھی آن موجود ہوا تھا۔ اس نے بھی سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک کر تصدیق کی اور کہا۔ ''جی ہاں آپ کی معیاد ختم ہوئی، اب یہ ان کا ہے۔''

''لیکن تمہیں کیا حق ہے، ہمارا کمرہ کسی کو دینے کا''

اُس نے کہا: ''جناب حسب قاعدہ آپ کو معیاد ختم ہونے سے دو دن پہلے مطلع کرنا چاہیے تھا کہ آپ اگلے ہفتے بھی اس میں فروکش رہیں گے یہ تو نہیں ہوسکتا کہ آپ کھڑے کھڑے خالی کر دیں اور ہمیں کرایہ دار کے انتظار میں جھکنا پڑے''۔

ہم نے کہا: تم ہم سے پورے ہفتے کا یعنی پیر تا اتوار کا کرایہ وصول کر سکتے تھے لیکن یوں ہمیں کمرے سے بے دخل کرنے کا اختیار نہ تھا۔''

پاسبان یا نگران جو بھی کچھ اسے کہیے مالٹا کا رہنے والا تھا اور مالٹا کے رہنے والے پاکستانیوں، ہندوستانیوں سے یوں بھی خار کھاتے ہیں۔

اس نے کہا: جناب پھر آپ ایسے لوگ ہی جھگڑا کرتے ہیں کہ پورے ہفتے کا کرایہ نہیں دیں گے۔ آپ کو کمرہ مطلوب تھا تو دو روز پہلے نہ کہہ سکتے تھے۔

یہ بات سچ تھی مگر ہمارا قصور زیادہ نہ تھا۔ ابوالحسین اپنی بیماری کے کارن لندن سے اپنی روانگی ہر روز ملتوی کرتے تھے اور ہم روز کوپن ہیگن کی سیٹ کینسل کراتے تھے۔ اب کے خیال تھا کہ جمعے یا ہفتے۔ حد سے حد اتوار کو، ہم کمرہ اور لندن چھوڑ روانہ ہو جائیں گے لیکن وہ نہ ہوا۔ یہ ہمارے گمان میں بھی نہ تھا کہ مالک کسی اور کرایہ دار کو لے آئے گا۔

ہم نے کہا: ''اچھا ہمیں کوئی اور کمرہ دے دو''۔

انہوں نے کہا: بالکل نہیں ہے کمرہ ہمارے ہاں:

ہم نے بہت کہا کہ ہم تمہارے پرانے اور مستقل گاہک ہیں۔ چار ہفتے سے یہاں مقیم ہیں۔ ہم سے یہ بے رخی نہ برتو۔ لیکن وہ خدا کا بندہ نہ پسیجا۔ بولا: کہیں اور ڈھونڈیے۔

www.pakistanipoint.com

یہاں اب آپ کو کمرہ ملنے سے رہا۔

ہم نے کہا: میاں ہمارا سامان تو کمرے ہی میں ہے اسے تو نکال لیں

بولا: جناب کمرے میں نہیں، نیچے سیڑھیوں کے پاس فرش پر ہم نے ڈھیر کر دیا ہے اسے فوراً اٹھوایئے۔ ورنہ ہم کسی چیز کی کمی بیشی کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔

یہ وقت کوئی گیارہ ساڑھے گیارہ بجے رات کا تھا۔ اور اس خلفشار کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم تنہا تھے۔ ممکن ہے ہاتھا پائی تک نوبت پہنچتی لیکن ہم نے دیکھا کہ ہاتھ ہمارے خالی نہیں۔ ایک میں دمپی تھی، ایک میں دودھ کی بوتل۔ یہ چیزیں کمرے میں بیٹھ کر کنڈی لگا کر کھانے کی تھیں، لیکن اس بے سروسامانی میں ان کا کیا کریں؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پاسبان سے کہا کہ بھیا ایک دو گھنٹے ہمارے سامان پر نظر رکھو، ہم کوئی اور کمرہ تلاش کر لیں تو اٹھائیں۔ وہ کچھ نہ بولا۔ کم از کم معترض نہ ہوا۔

گلی میں نکل کر ہم کو سب سے پہلے ہاتھ خالی کرنے کی فکر ہوئی۔ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر تو کچھ نہ کھایا جا سکتا تھا۔ چلتے چلتے بھی کھانا ممکن نہ تھا۔ لیکن ہوتا تو خلافِ تہذیب ہوتا۔ دو گلیاں چھوڑ تیسری گلی میں کچھ کاریں پارک تھیں۔ ہم نے ان کی اوٹ میں جا کر جلدی جلدی دمپی کے مچے کاٹے اور پھر غٹ غٹ دودھ پی گئے۔

پہلی بات یہی سمجھ میں آئی کہ سید اطہر علی سے استمداد کریں۔ کم از کم یہ رات اس کے کمرے کے فرش پر کاٹیں۔ کل مکان تلاش کریں۔ اس کا گھر تھوڑی دور تھا۔ گھنٹی بجائی۔ صدائے برنخاست۔ گویا موصوف ابھی باہر سے تشریف نہ لائے تھے۔ آدھ گھنٹہ اِدھر اُدھر گھوم کر پھر گھنٹی جا بجائی پھر کوئی جواب نہ آیا۔ اب کے ہم نے دوسری گھنٹی بجا کر لینڈ لیڈی کی خادمہ کو بلایا۔ وہ بکتی جھکتی برآمد ہوئیں اور کہا: کیا بات ہے جی

ہم نے کہا: اطہر کو پوچھتے ہیں۔

بولیں: پھر ان کی گھنٹی بجاؤ، مجھے کیوں تنگ کرتے ہو۔

ہم نے کہا: ''وہ تو ہے نہیں۔ اجازت ہو تو یہاں ڈیوڑھی میں بیٹھ کے انتظار کر لیں۔

www.pakistanipoint.com

باہر سردی بھی ہے۔

بولیں: ''بالکل نہیں۔ آپ باہر جایئے۔ میں پاکستانیوں کو خوب اچھی طرح جانتی ہوں۔ بہت بے ڈھب اور بدمعاملہ لوگ ہوتے ہیں۔ اطہر آ جائے تو اس کے ساتھ آندر آ سکتے ہو لیکن اس کے کمرے میں سونے کی کوشش پھر بھی نہ کرنا۔''

ہم نے لجاجت سے کہا۔ ''آج کی رات ہم بے خانماں ہیں۔ اچھا یہ اجازت دو کہ یہ رقعہ ان کے کمرے میں ڈال آئیں۔ اس کی انہوں نے ازراہ عنایت اجازت دے دی۔ اور ہم نے احوال اپنی بے دخلی کا رقم کر کے رقعہ اطہر کے کمرے میں پھینک دیا۔

باہر نکل کر ہم نے دیکھا کہ سامنے ہی ہوٹل ہے۔ نام اب اس کا یاد نہیں۔ گھنٹی بجائی تو ایک جلی کٹی چیں بجبیں بڑھیا برآمد ہوئیں بولیں۔۔۔'' یہ کیا وقت ہے شریف آدمیوں کو تنگ کرنے کا۔

ہم نے عمر بھر کی عاجزی اپنے لہجے میں سمو کر کہا کہ ہم اس وقت بے ٹھکانہ ہیں۔ آدھی شب کا عالم ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سوئیں۔ پھر آخر آپ کی دولت مشترکہ کے آدمی ہیں۔

بولیں: ''میں نے کوئی ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ جاؤ بھلے آدمیوں کو بے وقت پریشان نہیں کرتے۔ نہیں ہے جگہ میرے ہاں۔''

ایک اور ہوٹل میں پوچھا۔ وہاں بھی یہی جواب ملا۔

ایک فون سے قریبی ہوٹل سے بات کی۔ مینجر نے کہا: ہمارے ہاں جگہ ہے۔ تشریف لے آیئے۔ جب ہم خوش خوش وہاں پہنچے تو منیجر ہماری جلد کی رنگت دیکھ کر بہت گھبرایا: بولا جناب جگہ تو بالکل نہیں۔

ہم نے کہا۔۔۔ دس منٹ پہلے تم نے کہا تھا کہ ہے۔

بولا۔۔۔ جی ہاں! لیکن اس عرصے میں وہ رُک گئی۔ معافی چاہتا ہوں۔

یہ کہہ کر بڑے زور سے دروازہ بند کیا۔

www.pakistanipoint.com

اب کوئی عالم ایک بجے کا ہوگا۔ ہم نے سوچا اب دیکھیں اطہر آیا ہے کہ نہیں گھنٹی بجائی۔ اطہر صاحب برآمد ہوئے۔ ہم نے کہا: تم نے میرا رقعہ نہیں دیکھا تھا؟ مدد کو کیوں نہیں آئے؟

بولے: اب تمہارے گھنٹی بجانے پر دیکھا ہے ورنہ یہی خیال کیا کہ یونہی کوئی کاغذ ہو گا۔ اب میری لینڈ لیڈی تو بہت سخت ہے تمہیں میرے کمرے میں گھسنے نہیں دے گی۔ کہیں اور تلاش کریں۔

اب ہم دونوں نے ایک دو جگہ کوشش کی۔ لیکن ناکام۔ آخر انہوں نے کہا۔ یہ سامنے والے مکان کے پاسبان سے علیک سلیک ہے اور چونکہ میں یہاں کئی مہینوں سے رہتا ہوں شاید کام بن جائے۔

ہم نے کہا۔ ہم دیکھ چکے۔ ان کے ہاں بھی مطلق جگہ نہیں۔

اس کے باوجود ہم نے وہاں جا کے دستک دی۔ پاسبان صاحب نکلے۔ بولے جگہ بالکل نہیں۔ میں ان صاحب کو پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ اب اطہر نے ان کی خوشامد کی۔ اپنی ہمسائیگی اور ہماری بدحالی کا ذکر کیا اور کہا۔ فقط آج رات کی بات ہے کل یہ انتظام کر لیں گے۔

اس مرد شریف نے کہا: نیچے تہ خانے میں خادمہ کا کمرہ ہے اس میں یہ رات کاٹ لیں۔ کرایہ سوا پونڈ ہوگا لیکن علی الصبح کمرہ خالی کر کے سامان دفتر میں جمع کرا دیں اور گیارہ بارہ بجے تک اٹھوا لے جائیں۔

ہم نے اور اطہر نے ان کی انسان دوستی اور نیکی کا صدق دل سے شکریہ ادا کیا اور دونوں نے مل کر سامان ڈھویا۔ تین پھیرے ہوئے۔ اطہر سے معذرت کی کہ بھائی تمہیں بے حد تکلیف دی۔ خدا کا شکر کیا کہ چھت تو نصیب ہوئی۔

ارے بھئی یہ خط تو لندھور بن سعدان کی داستان بن گیا۔ ہم لکھیں اور پڑھا کرے کوئی۔ حالانکہ مذکور صرف اس کمرے کا تھا۔ کچھ ایسا برا نہیں۔ غسل خانے کمرے میں نہیں

www.pakistanipoint.com

لیکن کچھ دور بھی نہیں۔ چولہا کمرے کے کونے ہی میں ہے۔ واش بیسن بھی جس میں سے اس وقت بھی ٹپ ٹپ کی سریلی صدا آ رہی ہے۔ پانی قطرہ قطرہ گر رہا ہے کیونکہ نل پوری طرح بند نہیں ہوتا۔ کوئنز گارڈن کے جس مکان کا قصہ میں نے پھیلایا ہے وہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ لو اس کے تعلق سے ایک اور قصہ سنو۔ نمبر 50 کوئنز گارڈن میں کل چھ سات کمرے ہوں گے۔ ہمارا کمرہ پہلی منزل پر تھا۔ غسل خانہ نیچے گراؤنڈ فلور پر۔ اس غسل خانے کے ساتھ ایک کمرہ ہاؤس کیپر کا اور ایک میں ایک طرحدار اور طرار صاحبہ۔ وہ کیا کرتی تھیں۔ کیا کماتی کھاتی تھیں؟ یہ معلوم نہیں۔ ہاں ایک بار زور زور سے مالکہ مکان کے گماشتہ کے ساتھ لڑتی دیکھی گئی تھیں کہ تم لوگ مجھے بدنام کرتے ہو، جانے کیا سمجھتے ہو؟ خیر۔ ایک روز بوقت نیم شب اپنے کمرے سے نیچے غسل خانے میں جانے کے لئے زینہ زینہ اتر رہے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں، کوئی نیم تاریک کاریڈور میں صدر دروازے سے ہٹا کھڑا ہے۔ آواز دی کون ہے؟ یہ وہی صاحبہ تھیں۔

زینے کے قریب آئیں تو دیکھا کہ پئے ہوئے ہیں۔ لہٰذا لڑکھڑا رہی ہیں اور منہ میں سگریٹ ہے۔ بولیں ''آپ کے پاس ماچس ہے؟''

ہم نے کہا ''سوری! نہیں ہے''

وہ پھر بولیں: جناب میں ماچس مانگ رہی ہوں۔''

ہم نے ذرا وضاحت سے کہا:

''نہیں ہے ماچس ہمارے پاس۔ کیونکہ ہم سگریٹ نہیں پیتے'' یہ کہہ کر غسل خانہ میں چلے گئے۔

غسل خانے میں آدھ گھنٹہ تو لگا ہوگا۔ باہر نکل کر دیکھا کہ وہ وہیں کھڑی ہیں۔ بولیں ''پلیز۔۔۔ مجھے ماچس ضرور چاہیے''۔

ہمیں احساس ہوا کہ بیچاری کتنی ضرورت مند ہے۔ اس کے ساتھ ہی یاد آیا کہ برسلز سے ایک ماچس بطور سوینیر خریدی تھی۔ ہم نے کہا آپ یہیں ٹھہریے، میں اپنے سامان میں

www.pakistanipoint.com

تلاش کرتا ہوں۔

بولیں، میں آؤں، تلاش میں مدد دوں۔

ہم نے کہا: ''نہیں آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں، یہیں ٹھہریئے''۔

اوپر ابوالحسن تو سوئے ہوئے تھے ہم نے سوٹ کیس کے ایک کونے میں ماچس دریافت کر ہی لی اور نیچے آ کر ان صاحبہ کو تھما کے الٹے پاؤں سیڑھیاں چڑھنے لگے ہمیں تعجب تھا کہ انہوں نے شکریہ تک ادا نہ کیا۔ بھونچکی کھڑی رہیں۔ خیر ایسا ہوتا ہی ہے ہم اوپر آ کے سو رہے۔

دوسرے روز بی بی سی میں اپنے دوستوں سے یہ واقعہ بیان کیا تو ان کو لطیفہ مل گیا۔ پہلے تو خود ہنسے۔ پھر جو بھی ملتا اُس کو سنواتے کہ سنو رات انشا صاحب کے ساتھ کیا ہوا۔ ان سے کل رات ماچس مانگی گئی تھی۔ آخر ہم نے پاکستان سیکشن کی سیکرٹری مس مارجری کی طرف انصاف طلب نگاہوں سے دیکھا۔ ننھی منی سی لڑکی تھی۔ سن کر کھلکھلا کر ہنسی۔ بولی:

''پھر آپ نے اسے ماچس دی''۔

ہم نے کہا

''ہمارے پاس تھی ایک، برسلز سے خریدی تھی''۔

یک دم سنجیدہ ہو کر بولیں:

''کیا تم واقعی ایسے ہی بیوقوف ہو جی جیسی باتیں کر رہے ہو''

اس وقت آپ کے ہاں صبح دم یعنی دروازۂ خاور کھلنے کا وقت ہو گا لیکن یہاں چونکہ نیم شب کا عالم ہے۔ ایک بجنے کو ہے لہٰذا گڈ نائٹ۔ باقی دارد

www.pakistanipoint.com

کچھ قصہء دال چپاتی کا

لندن پہنچنے کے بہت دن بعد تک ہم انگریزی کھانے کو ترستے رہے۔ ہوا یہ کہ جس شام ہم یہاں وارد ہوئے ہوٹل میں ایک پاکستانی صاحب مل گئے بولے چلئے، پہلے آپ کو کھانے کا ٹھکانا بتادوں۔ ہم نے کہا: 'بسم اللہ' وہ پر پیچ گلیوں میں لے گئے اور ایک جگہ لے جا کر کہا ''یہاں آپ کو عمدہ پاکستانی کھانا اور حلال گوشت ملے گا۔'' اچھا تو نہ تھا۔ قیمے میں پانی بہت ڈال رکھا تھا، لیکن خیر۔ دوسرے روز بی بی سی میں ہمارے دوست آصف جیلانی نے بی بی سی کلب میں ہمیں پراٹھا اور کباب کھلائے۔ تیسرے دن انعام عزیز کھینچ کے ایک جگہ لے گئے جہاں بھنا گوشت، مغز اور ماش کی دال اور بگھارے بینگن وغیرہ سبھی تھے۔ چوتھے دن بدر عالم صاحب نے مہمان نوازی کا حق ادا کیا اور ہمیں روغن جوش کھلا کر جوش کے روغنی شعر بھی سنائے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ یارو چھری کانٹے کی نوبت بھی آئے گی کہ نہیں کہ عبداللہ ملک اپنے گھر لے گئے اور کہا۔ ولایتی کھانا کھا کر تم بے مزہ ہو گئے ہو گے، لو آج پاکستانی کھاؤ۔ اب ہم ان سے کیا کہتے۔ بہت رغبت سے ان کی روٹیاں بھی توڑیں۔ پھر سید سبط حسن کی ایسٹرن فیڈرل کمپنی نے ایک دعوت کر دی۔ اس میں بھی پلاؤ، بریانی، سیخ کباب اور پراٹھے ہی تھے۔

ایک جگہ تو جہاں بدر عالم ہمیں لے گئے تھے۔ بیرے نے کہا

''جناب کیا پان نہیں کھایئے گا؟''

بولے: ''جی ہاں! کیسا کھاتے ہیں آپ برابر کا؟''

www.pakistanipoint.com

بہت دن سے پان نہیں کھایا تھا۔ اس روز اس کا بیڑا بھی منہ میں رکھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ڈھونڈنے والے کو پان بخوبی مل جاتے ہیں لیکن سڑک پر پچکاری مارنے کی اجازت نہیں جگہ جگہ لکھا ہے کہ کچرا ڈالنے یا گندگی پھیلانے والے کو دس پونڈ جرمانہ۔

ہمارے ہاں کے ایک بزرگ کہ اسمبلی کے اسپیکر تھے۔ ایک روز جنیوا کے ہوٹل کے باہر سیر کر رہے تھے اور پان کی پچکاریاں مار رہے تھے کہ کچھ بچوں نے دیکھ لیا اور پولیس کو رپورٹ کی کہ ایک شخص خون تھوک رہا ہے۔ فوراً کانسٹیبل آئے اور کہا کہ چلو اسپتال۔ یہ بہت بھنائے اور انگریزی میں عذر کرنے لگے کہ میں تو یہ ہوں۔ وہ ہوں مجھے تم جیل نہیں بھجوا سکتے لیکن جنیوا کے کانسٹیبل انگریزی زبان کیا جانیں؟ اتفاق سے ایک بھلے مانس کا گزر ادھر سے ہوا۔ انہوں نے صورت حال سمجھی اور سمجھائی۔ اور ان سے کہا کہ پانوں کی ڈبیا نکال کر انہیں دکھایئے۔ بڑی مشکل سے چھٹکارا ہوا۔ لیکن ہوٹل والوں نے ان کے غسل خانے کو بھی رنگین پایا تو بہت جز بز ہوئے۔ یہاں تک تو انہوں نے برداشت کیا لیکن ایک روز ان بزرگ کو شک ہوا کہ یہ گوشت جو ہوٹل والے دیتے ہیں شاید ذبیحہ نہیں۔ انہوں نے ہوٹل والوں سے کہا، مجھے اپنا باورچی خانہ دکھایئے۔ وہ ایسا مصفا اور مجلّا تھا کہ ہوٹل والے اکثر مہمانوں کو فخریہ دکھاتے تھے۔ ان کو بھی لے گئے۔ سارا دودھ کی طرح اسپید۔ انہوں نے کہا کوئی مرغی لاؤ۔ وہ سمجھے یہ سوئٹزرلینڈ کی مرغیاں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک پلی ہوئی مرغی لا کر انہوں نے دی۔ پاس ہی چاقو پڑا تھا۔ انہوں نے اللہ اکبر کہہ کر اس کی گردن پر پھیر دیا۔ وہ پھڑ پھڑا کر ان کے ہاتھ سے نکل گئی لیکن ادھ کٹی گردن کے خون کے چھینٹوں سے سبھی کے کپڑے گلنار ہو گئے سارا باورچی خانہ بھی رنگین ہو گیا۔ یورپ میں خود مرغی یا کوئی اور جانور ذبح کرنا جرم ہے وہاں بھی یہ اپنی حیثیت کا حوالہ دے کر چھوٹے لیکن بعد میں اس ہوٹل والے پاکستانی کو دیکھ کر انکار کر دیتے تھے کہ ہمارے ہاں کمرہ نہیں ہے۔

لندن میں کوئی دو سو ہوٹل ہوں گے جن میں دیسی کھانا ملتا ہے۔ ممکن ہے زیادہ ہوں۔

www.pakistanipoint.com

www.pbookshop.com

ان میں سے اکثریت سلہٹ والوں کی ہے۔ کچھ میر پور کے بھی ہیں۔ پھر کچھ ہندوستانی بھی۔

ان ہوٹلوں کے نام عجب ہیں: تاج محل، نام کے تو کئی ہیں۔ پھر موتی محل اور ہیرا محل۔ محل کے لفظ کو تابع مہمل جان کر ایک صاحب نے تو تندور محل ہوٹل بھی کھول رکھا ہے۔ ابھی کوئی دلّی دربار ہوٹل یا اللہ کی رحمت کا محمدی ہوٹل البتہ ہماری نظر نہیں پڑا۔

لندن میں آٹا دال مرچ مسالے ہلدی دھنیا ہر چیز ملتی ہے اور خالص ملتی ہے۔ گھی کی جگہ مکھن ہے۔ اگرچہ بعض شوقینوں کے لئے دکاندار لوگ خالص پنجاب کا گھی بھی منگا رکھتے ہیں۔ اچار بھی ہر طرح کا موجود رہتا ہے۔

پچھلے ہفتے ہم لندن سے باہر لیسٹر اور برمنگھم بھی گئے۔ برمنگھم کے بعض محلوں میں ایشیا کے ایڈیٹر حبیب الرحمن صاحب ہمیں لے گئے۔ بالکل گوجرانوالے اور سیالکوٹ کا نقشہ پایا۔ ایک سڑک پر تو ستر فیصد دکانیں پاکستانیوں کی تھیں۔ یونس سویٹ مارٹ سے ہم نے بھی پیڑے اور جلیبیاں کھائیں۔ یہ دکان دین محمد قصائی حلال گوشت والے کی دکان کے عین سامنے ہے۔

یہاں مستقل رہنے والے پاکستانی بالعموم پاکستانی قصائیوں سے گوشت لیتے ہیں۔ جا بجا دکانیں ہیں جن پر لکھا ہے۔

''یہاں حلال گوشت ملتا ہے''

(بعضے ہلال گوشت بھی لکھتے ہیں)

لیکن ایک پاکستانی بیگم صاحبہ کا کہنا ہے کہ ہمارے یہ بھائی اول تو گوشت مہنگا بیچتے ہیں پھر اس میں پاؤ بھر ہڈی ضرور ڈالتے ہیں۔ پھر ان کا رویہ خاصا درشت ہوتا ہے۔ لہٰذا میں تو اب انگریز قصائی کے ہاں سے لینے لگی ہوں۔ سستا ہوتا ہے اور صاف اور عمدہ، ہڈی چھچھڑے کی مصیبت بھی نہیں۔

یہاں قصائی کی دکان آئینہ خانہ ہوتی ہے۔ جانوروں کا ڈاکٹر باقاعدہ معائنہ کرتا ہے۔

www.pakistanipoint.com

ہماری طرح رشوت دے کر خانہ ساز اور نہ پڑھی جانے والی جامنی مہر نہیں ٹھونکی جاتی۔ پھر گوشت کے نہایت نفیس پارچے موی کاغذ میں ملفوف سجے ہوتے ہیں۔ ان پر ان کی قسم اور قیمت لکھی رہتی ہے۔ بیچنے والا سپید براق ایپرن باندھے ہوتا ہے۔ شیشوں کے دروازے، کھڑکیاں اور ٹھنڈا رکھنے کو فریج۔ کسی بار تو یہ گوشت کچا کھانے کو جی چاہتا ہے۔

حلال وحرام کا امتیاز بڑی اچھی بات ہے لیکن اب یہ ہمیں تک رہ گیا ہے۔ لندن میں ہمارے ہوٹل میں ایک صاحب ایک اسلامی ملک کے تھے۔ دو تین روز کو آئے تھے۔ انگریزی نہ جانتے تھے لہٰذا ہمیں ترجمانی کرنی پڑتی تھی۔ مسز واٹسن نے پوچھا ان کو انڈا اور بیکن دوں؟ ہم نے کہا اے حرافہ خبردار! جیسا ناشتہ ہمیں دیتی ہو اسے بھی دو۔ مسلمان بھائی ہے۔ اس نے خالی انڈے توس لا دیئے ان صاحب نے ایک روز تو کھا لئے دوسرے روز ہم سے کہنے لگے۔ بڑی بی سے کہو ہمیں خالی انڈوں پر نہ ٹرخائے۔ ان کے ساتھ بیکن بھی دیا کرے۔ جب ہم نے دبے لفظوں میں کچھ کہا تو بخشنے لگے کہ مسلمان کا ایمان تو دل میں ہوتا ہے۔ معدے میں تھوڑا ہی ہوتا ہے اور شروع میں سؤر اس لئے حرام قرار پایا تھا کہ گندہ ہوتا ہے اور گندگی کھاتا ہے اب تو دیکھو کس طرح خاص طور پر خوراک کے لیے پالا جاتا ہے۔

ہم نے کہا بابا تو جو جی چاہے کھا۔ ہمیں مت قائل کرنے کی کوشش کر۔ آئندہ ہم تیری ترجمانی کریں تو سؤر کھائیں۔

لندن کے ایک اردو ہفتہ وار میں ایک پاکستانی مقیم انگلستان نے لکھا ہے کہ ہم پر قہر الٰہی نازل ہونے والا ہے۔ وہ اس لئے کہ یہاں آ کر پاکستانی بیئر پینے لگتے ہیں۔ قہر الٰہی کی ذمہ داری ہم نہیں لیتے لیکن شراب کے پرنالے یہاں ضرور بہتے ہیں اگرچہ بہکتے بہت کم لوگوں کو دیکھا ہے۔ میاں بیوی کھانے سے پہلے گھر میں چسکی لگا لیتے ہیں۔ گلی کے کونے کے پب میں بھی پیاس بجھاتے چلے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں ٹھنڈی آب وہوا میں خون کو گرم رکھنے کا اک بہانہ ہے ایک گونہ بیخودی اس سے ملتی ہے۔ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ

www.pakistanipoint.com

کو ان شراب نوشوں اور کافروں نے اتنا التزام البتہ کیا ہے کہ کوئی بے روزگار بھی ہو تو بھوکا نہ مرنے پائے۔ اسے اتنا وظیفہ سرکار سے ضرور ملے گا کہ گزارہ کر سکے۔ مکان کا کرایہ دے سکے، کپڑے پہن سکے اور اس کے بچوں کو دودھ میسر آ سکے۔ جتنے زیادہ بچے ہوں گے، اتنی زیادہ اس کی جان سکھی ہوگی۔ کام پر لگا ہے تو انکم ٹیکس کم ہوگا۔ بیروزگار ہے تو وظیفہ زیادہ ہو گا۔ ایک صاحب ذکر کر رہے تھے کہ ہمارا ایک کلرک نوکری چھوڑ گیا ہے۔ کہنے لگا جناب ڈیڑھ پونڈ میں ہفتہ بھر نو سے پانچ بجے تک کام مجھ سے تو نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ بیروزگاری کی صورت میں اسے جتنا وظیفہ ہفتے میں مل سکتا ہے، تنخواہ اس سے فقط ڈیڑھ پونڈ زیادہ ملتی ہے۔ پھر کیوں نہ گھر میں پڑا چارپائی توڑے اور معمے حل کرے۔ ایک مزدور کا پچھلے دنوں ٹیلی ویژن انٹرویو آیا تھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ کام کیوں نہیں کرتے؟ بولا۔ جناب کام کروں تو بیوی بچوں کو کیا کھلاؤں؟ تفتیش پر معلوم ہوا کہ آٹھ بچے ہیں۔ اگر کام کرے تو سولہ پونڈ ہفتہ پائے گا۔ بیروزگاری کا وظیفہ ستائیس پونڈ فی ہفتہ بن جاتا ہے۔

www.pakistanipoint.com

کچھ چکھوتیاں کلچر کی

ہماری ڈائری سے یہ گمان نہ کیا جائے کہ ہمارا سارا وقت یورپ میں مکان کی تلاش یا غسل خانوں کی پیمائش میں گزرتا ہے لیکن کیا کیا جائے جہاں رہنا چار دن ہو اور ان میں سے دو آرزو میں کٹ جائیں دو انتظار میں۔ وہاں اور کیا محل گفتگو ہو سکتا ہے گیارہ بارہ دن مسٹر واٹسن کے بوسیدہ تہہ خانے میں بسر کرنے کے بعد یہ کمرہ ملا ہے۔ علیحدہ خواب گاہ، علیحدہ نشست گاہ، علیحدہ غسل خانہ بھی جو فی زمانہ نہیں ملتا۔ کرایہ اس سے پونے دوگنا لیکن خیر۔ ہمارا آدھا وقت تو غسل خانے میں صرف ہو جاتا ہے۔ من کا میلا پن دور نہیں کر سکتے تو تن تو اجلا رہے۔

ان مکروہاتِ دنیوی سے فرصت پا کر ہم کلچر کی چکھوتیاں بھی کرتے رہے ہیں۔ برٹش میوزیم میں گئے۔ کیا پرانی پرانی چیزیں بھر رکھی ہیں۔ ٹوٹی پھوٹی مورتیاں، پرانے وضع کے مٹکے اور لوٹے، مٹیالی کیڑے کھائی کتابیں۔ ان سے کہیں بہتر چیزیں تو یہاں بازار کی ہر دوکان میں مل جائیں گی۔ اور نئی۔ اس کے کتب خانے کو بھی ہم نے دیکھ ڈالا۔ وہی وہانوی کا کوئی ناول نہ ملا۔ کارڈ بنوائے گئے تو ایک ترش رو اسسٹنٹ نے کہا۔ کبھی پہلے بھی ممبر رہے ہو؟ ہم نے کہا ہاں آج سے چھ سال پہلے ستمبر میں بنا تو تھا۔ وہ چھت پر گیا اور ہمارا کارڈ نکال لایا۔ کارڈ بنانے والا بہت خوش دل اور علم کی قدر کرنے والا تھا۔ اس نے ہماری علمیت کو ہمارے چہرے ہی سے بھانپ لیا اور ہمارے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھا۔ ہم آبدیدہ سے ہو گئے کہ موتی کی قدر سمندر سے نکل کر اور ہیرے کی قدر کان سے باہر آ کر ہی ہوتی ہے۔

www.pakistanipoint.com

مصر کی قدیم تہذیب کا ہم نے بہت شہرہ سنا تھا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ ولادت مسیح سے ہزار دو ہزار سال پہلے تہذیب کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے اہرام بنائے۔ ممیاں بنائیں اور دفن کیں اور نہ جانے کیا کیا کیا۔ برٹش میوزیم کے کئی کمروں میں اس تہذیب کے آثار پھیلے ہوئے ہیں جن میں بادشاہوں اور پروہتوں کے علاوہ ان کی روزمرہ زندگی بھی کھلونوں اور ماڈلوں کی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہم تو ذرہ بھر پھر متاثر نہیں ہوئے۔ ان کے تین ہزار سال پہلے کے آلاتِ زراعت دیکھے۔ کوئی کمال نہیں ویسے ہی ہیں جیسے آج کل ہم استعمال کرتے ہیں۔ لوہاروں اور بڑھیوں کے ہتھوڑے اور تیشے بھی ایسے ہی ہیں جو پاکستانی دیہات میں مستعمل ہیں۔ لباس کا بھی ایسا زیادہ فرق نہیں۔ زمین سے پانی نکالنے کے طریقے رہٹ اور ڈھینگلی وغیرہ ضرور ہمارے آج کل کے دیہاتی طریقوں سے ذرا بہتر ہیں لیکن ایسا زیادہ فرق نہیں کہ اس پر کتابیں لکھیں۔ قدیم مصر کے کھدائی کرنے والوں نے شاید ہمارا ملک نہیں دیکھا، ورنہ انہیں زمین کھودنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ زمین کے اوپر ہی یہ ساری چیزیں اتنی افراط میں مل جاتیں کہ ایک چھوڑ دس میوزیم آباد کرلیں۔

اہرام ہم نے ابھی نہیں دیکھے۔ انشاء اللہ اسی سفر کے دوران دیکھیں گے لیکن تصویر سے تو یونہی نکیلے تکونے مینار نظر آتے ہیں۔ سنا ہے بیس بیس تیس تیس سال میں بنے ہیں۔ یہ بھی کوئی کمال نہیں ہمارے ہاں قائداعظم کا مقبرہ بھی دس سال سے بن رہا ہے اور کچھ عجب نہیں مدتِ تعمیر میں ہم اہرام کو پیچھے چھوڑ جائیں۔ اس زمانے کے مصری نہ ٹائی لگاتے تھے، نہ سوٹ پہنتے تھے، اور یہاں تک دریافت ہوا ہے کہ انگریزی تک نہ بولنا جانتے تھے۔ پھر بھی ہمارا ذکر کہیں نہیں اور ان کی تہذیب کا غلغلہ ہے۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

ہمیں سرسید احمد خاں کے ایک رسالے کی تلاش تھی جو انہوں نے ہندوستان کے قدیم دیہی نظام پر لکھا تھا۔ سرسید کی تالیفات ہیں اس کا ذکر کم ہی آتا ہے۔ خیر وہ مل گیا۔ لیکن ہم نے فہرست میں دیکھا کہ مصنف کا نام احمد خاں درج ہے۔ احمد خاں سید۔ غالب کو بھی ہم

www.bookspoint.com

نے غالب کے تحت نہیں بلکہ اسد اللہ خاں کے تحت پایا۔ لکھا تھا: ''اسد اللہ خاں مرزا'' آگے چل کر لکھا ہے کہ غالب بھی کہلاتے تھے۔ فہرستیں بنانے والے انگریزوں کی دیدہ ریزی کی پھر بھی داد دیجیے، کیونکہ ان کے ہاں کتاب پر سیدھا سیدھا نام لکھنے کا رواج ہے۔ ولیم شیکسپیئر۔ ایچ جی ویلز۔ جارج برنرڈ شا وغیرہ۔ یہاں ہم نے اُردو الف لیلہ کے پرانے نسخے نکلوائے تو ایک پر مؤلف کا نام یوں لکھا پایا:۔

''تالیف ناظم و ناثر بے مثال بذلہ سنج نازک خیال جلا بخش اردو زبان اعجاز بیان جناب میرزا رجب علی بیگ سرور''۔

ہم تو خیر پہچان جاتے ہیں کیونکہ ہمارے ہاں خود اپنے نام کے ساتھ علامہ یا ناخدائے سخن وغیرہ لکھنے کی روایت ہے لیکن ایک انگریز کا اس میں غوطہ لگا کر صحیح نام نکال لینا کمال کی بات ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ ان کا نام فہرست میں ''ب'' کی تختی میں یوں ہوتا ''بذلہ سنج نازک خیال، جو علی بیگ سرور بھی کہلاتے تھے'' وغیرہ۔ خیر موصوف نے جس طور آغاز داستان کیا ہے وہ بھی سننے کے لائق ہے'' یہاں سے یہ کج مج زبان، پنبہ در دہان، آوارۂ چار سو، سرمہ حیرت در گلو، خزاں دیدہ؟ کردہ وطن، یار و دیار سے دور مرزا رجب علی بیگ سرور، سخن فہم قدر دانوں کی سمع خراشی، اپنے زخم جگر پر نمک پاشی کرتا ہے..... آگے توضیح کی ہے کہ ترجمہ تو الف لیلہ کا اردو میں تھا لیکن سیدھا سیدھا عام فہم زبان میں تھا۔ ایک رئیس نے فرمائش کی کہ بابا مجھ سے یہ نہیں پڑھا جاتا، اسے مسجع اور مقفیٰ نثر میں دوبارہ لکھو۔ اس فقیر نے اس فرمان کو واجب تعمیل جانا..... کتاب کے آخر میں ہیچمدان سراپا عیوب محمد یعقوب سخنور فصیح اللسان محمد صادق خاں اور جناب منشی دھنپت رائے محقق کے لکھے ہوئے قطعات تاریخ بھی شامل ہیں۔

میرزا حیرت نے جو الف لیلہ ترجمہ یا تالیف کی اس کی پیشانی پر لکھا ہے۔ الف لیلہ نثر بطرز ناول۔ یہ اس زمانے کے آدمی تھے جب پرانی اردو میں نئی روشنی کے پیوند لگ رہے تھے اس میں ہر جگہ گفتگو مکالموں کی شکل میں ہے۔ اندرون سرورق ایک طرف تو ناثر عدیم

النظیر و ناظم فقید المثال حضرت مولوی محمد اقبال حسین المتخلص بہ عاشق دام فیضہ کے دیوانوں اسرار عاشق اور افکار عاشق کا اشتہار ہے۔ جن کو معانی لغز کا دفتر اور محاوراتِ اردوئے معلیٰ کا مخزن کہا گیا ہے دوسری طرف کتب زیر طبع میں لندن کی مسیں، پیرس کی مسیں، برلن کی مسیں کے نام درج ہیں۔

ع: ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

انگریزی سے خوشہ چینی کی بھی تو کیا کی۔ میرزا حیرت کے مسدس حیرت کا اشتہار بھی دیکھا۔'' اس مسدس میں مولانا حالی کے مسدس کی تردید بڑی لیاقت سے کی گئی ہے جس زبان پر ان کو بڑا ناز تھا۔ اس کو دہلی کے محاورے کے خلاف ثابت کر کے دکھایا ہے۔'' ہائے یہ اگلے وقتوں کے لوگ جن میں سے کچھ آج بھی باقی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانے میں فنی کتابیں بھی لکھی جاتی تھیں۔ ایک کا اشتہار دیکھئے ''رسالہ کبوتر بازی مع کھیل، بلبل، از مرزا محمد اختر۔'' کمپیوٹر تو بڑی بات ہے اگر اس ماحول میں پلے ہوؤں کی عقل بائیسکل کو دیکھ کر حیران رہ جائے تو قابل معافی ہیں۔

آج کل مارکس کی صد سالہ برسی پر یہاں برٹش میوزیم میں مارکس کی کتابوں کے پرانے ایڈیشنوں کی نمائش ہو رہی ہے۔ ان کے خطوط بھی انگریزی اور فرنچ میں لکھے ہوئے رکھے ہیں۔ مارکس بہت دن لندن میں رہے اور امریکہ کے انگریزی اخباروں کے نامہ نگار تھے۔ زیادہ وقت یہیں برٹش میوزیم کے دارالمطالعہ میں گزارتے تھے۔ کسے معلوم تھا کہ انہی کی تحریریں انگریزوں اور امریکیوں کے پاؤں تلے سے زمین نکالیں گی۔

ہاں ہم نے اس باکمال سر لارنس اولیور کا ایک کھیل بھی دیکھا۔ سعید جعفری ایک ذہین نوجوان یہاں اسٹیج پر نام پیدا کر رہے ہیں۔ وہ سٹرنڈبرگ کے ڈرامے ''رقص موت'' کے ٹکٹ کہیں سے لے آئے، ورنہ تو اگلے چار ماہ کے لئے ساری سیٹیں بُک تھیں۔ اداکاری کیا تھی، اعجاز تھا اعجاز۔ یہ کھیل وقفے وقفے سے اولڈوک تھیٹر میں ہو رہا ہے۔ یاد رہے کہ گزشتہ مئی میں سر لارنس کے پتے کا اپریشن ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے کئی ہفتے مکمل آرام کی ہدایت کی

www.pakistanipoint.com

تھی۔لیکن ان ہی دنوں ان کی منڈلی کے ایک دو کھیلوں کی ریہرسلیں ہو رہی تھیں۔موصوف اوپر کی منزل سے کھڑکی کے راستے نکل، پائپ کو پکڑ کر اتر آئے اور آج تک فرار ہیں۔

فلمیں ہم اپنے وطن میں بھی عموماً یا تو کارٹون دیکھتے ہیں یا لارل ہارڈی سے رغبت رکھتے ہیں۔سو یہاں کے کلاسیک سینماؤں میں ہمارا یہ حال ہے کہ اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے۔ اور پھر باادب باملاحظہ ہوشیار۔اوپر کی آنکھیں اوپر، نیچے کی نیچے۔ہم نے ''فینی ہل'' بھی دیکھی۔رسوائے زمانہ فحش کتاب کی فلم، باہر لکھا تھا،'' خاص برائے بالغاں''لیکن خیر ہمیں کسی نے نہ روکا۔ہم اس فلم کو دیکھ کر پہلے ہنسے پھر روئے۔کیونکہ اس میں توفینی ہل بالکل نیک پروین ہے۔جتنے لوگ اسے گناہ پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کی آبرو پر حملے کرتے ہیں ان سب کو وہ مردانہ وار پچھاڑ دیتی ہے۔انجام بالکل ہماری فلموں کا سا ہے۔ آخری سین میں اس کا نکاح گرجا میں ایک اوباش سے کیا جا رہا ہے کہ ہیرو یعنی بی بی کا اصلی اور مخلص عاشق زار دروازے توڑ کر اندر آتا ہے اور ببانگ دہل اعلان کرتا ہے۔''یہ شادی نہیں ہو سکتی'' اور آخر وہ باعصمت خاتون اپنے پاکباز شوہر کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے چلی جاتی ہے۔اس سارے قصے میں فحش صرف ایک چیز لگی۔وہ گالیاں جو فلم دیکھنے والے بالغ اپنے پیسے برباد ہونے پر سینما والوں کو دیتے ہیں۔یوں لگتا ہے جیسے اس فلم کا سیناریو کسی وکٹورین ادیب سے لکھوایا گیا ہو۔بلکہ کچھ عجب نہیں ملکہ وکٹوریہ نے خود لکھا ہو۔ یہ فلم تو شیر خوار بچوں تک کو آسانی سے دکھائی جا سکتی ہے۔

www.pakistanipoint.com

ٹاور سے موم گھر تک

تنہائی، تنہائی۔ اسّی نوے لاکھ بلکہ شاید کروڑ سے زیادہ آبادی کے شہر میں تنہائی! لیکن تنہا گریستن میں ایک مزا بھی ہے تبھی تو غالب نے اس کی تمنا کی تھی کہ ع

''رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو''

دعا انہوں نے شاید اپنے لئے مانگی تھی، پوری ہمارے حق میں ہوئی۔ غالب نے بے در و دیوار سا اک گھر چاہا تھا۔ پچھلے ہفتہ تک ہمارا جو کمرہ رہا ہے اس کا ناک نقشہ اس سے چنداں مختلف نہ تھا۔ غالب کو یہ بھی حسرت تھی کہ کوئی ہمسایہ نہ ہو اور ہمزبان کوئی نہ ہو۔ ہمسایہ تو خیر بے شمار ہیں لیکن بڑے شہر کے ہمسائے کیا۔ برسوں رہ کر ایک دوسرے کے غم میں شریک ہونا تو درکنار، ایک دوسرے کے نام سے بھی واقف نہیں ہو پاتے۔ ہم زبانی کا یہ ہے کہ ہمارے ہوٹل میں قریب قریب سبھی افریقی ہیں یا پھر ایک امریکن لڑا ہے۔ ناشتے پر گڈ مارننگ۔ گڈ مارننگ ہو جاتی ہے اور بس۔ غالب صاحب کو یہ بھی آرزو تھی کہ پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار۔ سو بر سرِ اولاد آدم یہ بھی گزری۔ ہم کھانسی بخار زکام میں ڈیڑھ دن تک اپنے کمرے میں پڑے رہے۔ کسی نے نہ پوچھا کہ بھیا کیسے ہو؟ آخر ہاؤس کیپر کے کہنے پر سینٹ میری اسپتال کے آؤٹ پشنٹ ڈیپارٹمنٹ میں گئے۔ انہوں نے کہا فلاں سڑک کے فلاں کوچے میں ڈاکٹر ہارٹ کے پاس جاؤ اور یہ پرچی دے دو، وہ مسیحائی کریں گے۔ وہاں پہلے ہی پندرہ آدمی انتظار کر رہے تھے اور اپنی اپنی باری پر ڈاکٹر سے پوچھتے تھے کہ آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟ ہمیں بھی انہوں نے ایک منٹ میں بھگتا دیا۔ یہ بات کچھ

www.bakhtiindint.com

اچھی نہ لگی۔ کیونکہ ہمیں ذرا دل جمعی سے عرض حال کرنے کی عادت ہے کہ ڈاکٹر صاحب یہ کیا بیماری ہے۔ کھانے میں کیا کھائیں اور کس شے کا پرہیز کریں۔ کھچڑی ہمیں پسند نہیں، کچھ اور بتایئے۔ کیا دہی بڑے، ماش کی دال اور بڑے گوشت کے کباب کھا سکتے ہیں؟ دن میں کے بار دوا لینی ہے وغیرہ..... جس ڈاکٹر کو اتنا کچھ سننے کا یارانہ ہو اس کے پاس ہم جاتے ہی نہیں۔ لیکن یہ معاملہ پردیس کا تھا۔ اس مرد متمکن نے پرچی پر کچھ لکھ دیا کہ کسی کیمسٹ کے پاس چلے جاؤ۔ کیمسٹ نے ایک پچکاری سی دی کہ منہ کھول کر گلے میں مارو۔ ہم نے کہا۔ دن میں کے بار، اور اپنے گلے میں یا کسی اور کے۔ فرمایا یہ تو ڈاکٹر سے پوچھنا تھا حضرت۔ ہم نے کہا پیسے؟ بولے پیسے کچھ نہیں۔ اس ملک میں علاج معالجہ مفت ہے۔ مایوس اور غیر مایوس العلاج ہر قسم کے مریضوں کا۔

ہمیں یہ بات معلوم ہوتی تو ہم اب تک کئی بار بیمار پڑ چکے ہوتے۔ امریکہ میں تو ہر چیز کی طرح علاج بھی اتنا مہنگا ہے کہ اس کے لئے جان بیچنی پڑتی ہے۔ اسی لئے بہت سے امریکن اپنی پیچیدہ بیماریوں کے علاج کے لئے ٹورسٹ بن کر انگلستان آ جاتے تھے۔ یہاں ہسپتال میں داخل ہو جاتے اور مزے کرتے۔ کرایہ وغیرہ دے کر بھی امریکہ کے مقابلے میں بہت سستا رہتا تھا۔ اب شاید کچھ پابندیاں لگ گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اسی بیماری کا علاج مفت ہوگا جو یہاں آ کر لگی ہے یہ نہیں کہ آپ باہر سے بیماری لے کر آئیں۔ ہم بھی اپنی بیماریٔ دل اور درد تنہائی کا علاج یہاں کرانا چاہتے تھے۔ ان کے ساتھ بھی یہی قباحت لگی ہے کہ یہ آزار پاکستان سے ہم اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔ یہاں کے لوگوں نے ان کی دوا کرنے سے انکار کر دیا۔

ذکر تنہا گریستن کے مزے کا تھا۔ آج ہی کا لیجئے۔ صبح نکل گئے۔ صبح سے ہمارا مطلب ہے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کیونکہ

ع نہ سیکھے ہم نے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

آدھی رات سے کچھ پہلے واپس آئے۔ آج ہفتے کا دن تھا۔ دفتر آج بند رہتے ہیں۔

www.pakistanipoint.com

کوئی کار منصبی تھا نہیں۔ لہٰذا لندن ٹاور کا رخ کیا۔ ٹاور ہم نے 1961ء میں بھی دیکھا ہے لیکن اس میں ایک عجیب آسیبی کشش ہے۔ اس کی زیادہ عمارتیں تیرہویں صدی کی ہیں۔ بعض اس کے بعد اور اس سے پہلے کی بھی۔ یہ عجیب جائے عبرت ہے۔ کتنے ہی بادشاہوں اور ملکاؤں اور امیروں نے ان برجوں میں اسیری کے دن گزارے اور پھر اکثر نے یہیں جلاد کے کلہاڑے کے سپرد اپنی گردنیں کیں۔ وہ جگہ احاطے کے اندر زنجیروں سے محفوظ کر کے الگ کر دی گئی ہے۔ جہاں ملکہ این بولین (ہنری ہشتم کی دوسری بیگم) اور ملکہ کیتھرائن ہووارڈ (انہی بادشاہ سلامت کی پانچویں بیوی) لیڈی جین گرے، دو تین مشہور نوابوں اور نواب زادیوں کے سر قلم کئے گئے۔ ملکہ این بولین سے ایک رعایت البتہ برتی گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میرا سر کلہاڑے سے نہیں تلوار سے قلم کیا جائے چنانچہ اس کے لئے خاص طور پر تلوار منگائی گئی۔ ایک امیر لارڈ اسپنگر نام کے ڈیوک آف گلوسٹر کے درباریوں میں سے تھے۔ نہایت منتظم مانے جاتے تھے۔ ان سے کوئی قصور ہوا تو آقائے ولی نعمت نے کہا جناب لارڈ صاحب، آپ سے زیادہ رموز مملکت کون جانتا ہے۔ آپ کے جرم کی سزا قاعدے سے کیا ہونی چاہیے۔ اس نے کہا جناب اس کی سزا تو از روئے قاعدہ گردن مارنا ہے۔ چنانچہ قانون کا تقاضا پورا کیا گیا۔

ان برجیوں میں ہر ایرا غیرا قید ہونے یا گردن کٹوانے کا شرف حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سعادت فقط شاہی خاندان کے لوگوں کے یا امرا کے حصے میں آتی تھی۔ کیونکہ جیل کا سارا خرچ مقدمے کا خرچ، حتیٰ کہ جلاد کی فیس، کلہاڑے اور لکڑی کے کندے کا خرچ بھی مجرم یا قیدی ہی کے ذمے ہوتا تھا۔ داخل ہوتے ہی داہنے ہاتھ کو باب غداراں کی چوڑی محراب ہے۔ دریائے ٹیمز سے ایک خندق یہاں آتی تھی اور قیدیوں اور کشتہ ہونے والوں کو ٹیمز کے راستے اسی محراب کے نیچے سے یہاں لایا جاتا تھا۔ اس کے عین سامنے اسی زمانے کا خونی برج ہے۔ کیسے کیسے سرفراز ان دونوں دروازوں کے نیچے سے گزرے تھے۔ سولہویں صدی میں ڈیوک آف بکنگھم، ملکہ این بولین کرامویل، ارل آف ایلکس، ملکہ کیتھرائن

www.pakistanipoint.com

ہیوارڈ، ڈیوک آف سمرسٹ، لیڈی جین گرے، ڈیوک آف من متھ اور نہ جانے کون کون۔ خود ملکہ الزبتھ اول کچھ دن یہاں قید رہیں۔

خونی برج کے اوپر کے کمرے میں سر والٹر ریلے نے اپنی اسیری کے بارہ سال گزارے۔ اس کا پلنگ، اس کی کرسی دونوں موجود ہیں۔ یہیں اس نے تاریخ عالم لکھی جس کا پہلا ایڈیشن اسی کمرے میں دھرا ہے۔ اوپر ذرا سی جگہ ہے جہاں اسے چند قدم ٹہلنے کی اجازت تھی اور اب تک والٹر ریلے واک کہلاتی ہے اس اولوالعزم کا آخر حکم شہنشاہی سے 1618ء میں سر تن سے جدا ہوا۔ اس احاطے میں مرنے والیوں میں سے ایک بی بی خاص جرأت والی تھیں۔ ان کو جرم بے وفائی میں جلاد کے سپرد کیا گیا تھا۔ انہوں نے مرنے سے پہلے اعلان کیا کہ بے شک میں ملکہ انگلستان کے طور پر مر رہی ہوں لیکن یہ میرے لئے کوئی ذریعہ عزت نہیں۔ میرے لئے اس سے زیادہ سرمایہ افتخار اپنے یار کی محبوبہ ہونا ہے۔ ان کا یہ آشنا بھی اسی چہار دیواری میں اذیت کی موت مرا۔

ٹاور کے ایک طرف کی عمارت میں اسلحہ کا میوزیم بھی ہے۔ جنگجوؤں کے خود، زرہ بکتر اور چار آئینے تو ہر جگہ دیکھے ہیں۔ گھوڑوں کے زرہ بکتر بھی کئی جگہ نظر آئے لیکن ہاتھی کا زرہ

www.pakistanipoint.com

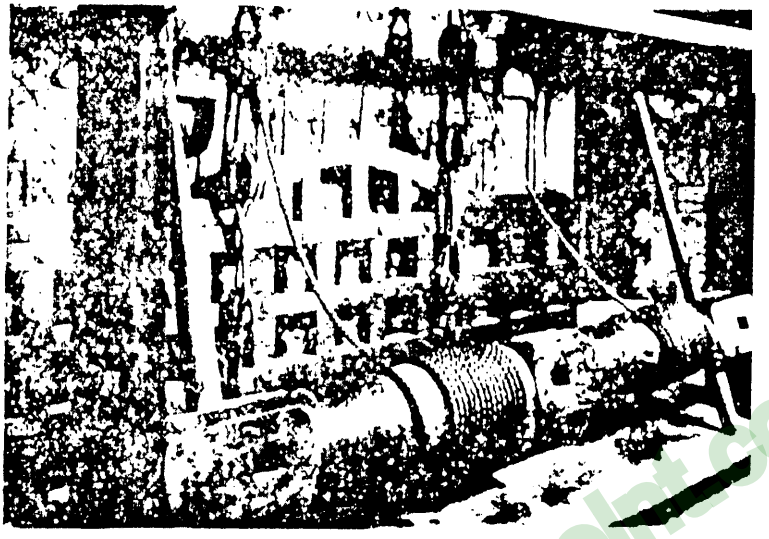

بکتر یہیں دیکھا۔ پورا ہاتھی لوہے کی زرہ میں ہوتا تھا۔ یہ زرہ کلایو صاحب ہندوستان سے لائے تھے۔ اور خیال کیا جاتا ہے کہ جنگ پلاسی میں نواب سراج الدولہ کی فوج کے کسی ہاتھی کی زینت رہی ہوگی۔ بہت سے ہتھیار اور زرہیں یہاں ساختہ لاہور ہیں۔ ایک دو ساختہ سندھ بھی۔ ہتھیاروں میں شمشیریں، خنجر، پیش قبض، قرولیاں، بھانت بھانت کے تحفے ہندوستان کے یہاں دیکھے۔

ٹاور آف لندن کے کوّے بھی مشہور ہیں۔ یہ کوّے ایک خاص نسل کے ہیں اور فقط ان برجوں پر نظر آتے ہیں۔ کئی صدیوں سے یہ مشہور چلا آرہا ہے کہ جس روز یہ ختم ہو گئے اسی روز ٹاور گر جائے گا اور سلطنت انگلشیہ ختم ہو جائے گی۔ سلطنت انگلشیہ کے ختم ہو جانے میں کیا کسر رہ گئی ہے یہ تو ہمیں معلوم نہیں لیکن کوے بہر صورت زندہ ہیں اور وہائٹ ٹاور بھی سلامت کھڑا ہے۔

باقی دن ہم نے مادام تساو کی مومی شبیہوں کی گیلری اور ان کا چیمبر آف ہارررز یعنی ایوان دہشت دیکھنے میں گزارا۔ یہ بیکر اسٹریٹ میں ہے اور اس میں موت کی سزا پانے والے مجرموں کے پتلے کھڑے ہیں۔ یہاں عجب دھوکا ہوتا ہے۔ اندر داخل ہو کر ہم نے

www.pakistanipoint.com

مادام تساؤ

گارڈ کے سپاہی کو ٹکٹ دکھایا تو اس نے توجہ ہی نہ کی۔ معلوم ہوا موم کا ہے۔ اوپر چڑھے تو ایک پتلا بالکل انسان کی صورت میں کھڑا تھا۔ ہم نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو بولا کیا کر رہے ہیں جناب، آئینہ خانے کی گیلری میں ہم نے ایک صاحب کو دیکھا کہ جس طرف کو ہم جاتے ہیں اسی طرف کو وہ آتے ہیں۔ آخر ٹکرا گئے۔ ہم نے کہا۔ سوری۔ لیکن شیشے کی ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ تب معلوم ہوا۔ یہ تو ہم خود ہی تھے۔ ہمارا عکس ہی تھا۔

لندن میں میوزیم ایک نہیں، بہت ہیں۔ ایک میوزیم سائنس کا ہے، ایک نیچرل ہسٹری کا جس میں جانوروں کے ڈھانچے رکھے ہیں۔ بعضے پودے، مچھلیاں، سیپ ڈھانچے وغیرہ لاکھوں سال پرانے ہیں۔ ایک آٹھ فٹ لمبا کچھوا (مردہ ڈھانچہ) بھی نظر آیا۔ جو کوہ شوالک کے دامن سے پکڑا گیا تھا۔ پرانے جانوروں میں بعضے تو بارہ بارہ چودہ چودہ سو من کے تھے۔ انسان ان کے سامنے کل کا بچہ ہے۔ اس کی عمر جمعہ جمعہ آٹھ دن کی یعنی فقط تیس لاکھ سال بتائی جاتی ہے جب کہ مچھلیاں 50 کروڑ سال پہلے موجود تھیں اور پرندے 14 کروڑ سال پہلے۔ دودھ دینے والے جانوروں میں بھی انسان سب سے پھسڈی ہے

www.pakistanipoint.com

کیونکہ دوسرے جانور بیس کروڑ سال پہلے وجود میں آ گئے تھے، جانے اتنے بہت سے جانوروں کا دودھ کہاں جاتا ہوگا۔ کہاں بکتا ہوگا۔ کون ان میں پانی ملاتا ہوگا۔ کیونکہ انسان اس زمانے میں نہیں تھے تو گوالے بھی نہیں ہوں گے۔

نیچرل ہسٹری میوزیم کے ایک برآمدے میں ایک درخت کا تنا پڑا نظر آیا۔ یہ اتنا پرانا تو خیر نہیں کہ آثار قدیمہ والوں کی توجہ کے قابل ہو، تاہم ہماری عقل اسے دیکھ کر اور یہ جان کر حیران ہوئی کہ چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں جب روم اپنے عہدِ زوال میں تھا تو یہ پودا 43 سال کا تناور درخت تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب مدینہ ہجرت کی تو 65 سال کا تھا۔ برطانیہ کا مشہور بادشاہ الفرڈ اعظم تخت نشین ہوا تو یہ بابائے درختاں زندگی کی تین صدیاں پوری کر چکے تھے۔

مشہور پل لندن برج جو اب ڈھا کے دوبارہ بنایا جانے والا ہے، اس درخت سے عمر میں 457 سال چھوٹا ہے۔ میگنا کارٹا پر دستخط ہونے کے وقت یعنی 1215ء میں اس کی عمر ساڑھے چھ سو برس کی تھی۔ شکسپیئر کے مرنے کے وقت 1069 سال اور لندن کی مشہور آگ لگی تو یہ بزرگ گیارہ سو سال کے ہو چکے تھے۔

ہمارے ہاں بھی بڑے بڑے معمر درخت ہیں لمبی لمبی ڈاڑھیوں والے، لیکن یہ درختوں کا سرسید، یا بابائے اردو ان سب کا رشتے میں دادا رہا ہے، افسوس اس نے ابھی اپنی عمر عزیز کے 1235 سال پورے کئے تھے کہ کسی ظالم نے 1892ء میں اس پر آرا چلا دیا۔ ع

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

www.pakistanipoint.com

گورے دیکھے، کالے دیکھے

لندن دیکھا۔لندن والے دیکھے، گورے دیکھے، کالے دیکھے، ہاں دوستو! کالے، لیکن سچ مچ کے کالے۔ چونچ بھی کالی، پَر بھی کالے۔ گو ہمیں بھی دعویٰ روسیاہی کا ہے لیکن فردا کی تقدیر معلوم ہوتا ہے کہ افریقہ کے ہاتھ میں ہے۔ احساسِ کمتری یعنی چہ؟ ہمیں تو اپنے ان بھائیوں میں صاف احساس برتری دکھائی دیتا ہے۔لندن میں بیرونی طالب علموں میں دیکھو یا گلیوں، کوچوں میں کام کرنے والوں کو، ٹیوب میں، بس میں، فلیٹ میں، دکان میں، ہر جگہ گورے کے ساتھ کالا نظر آتا ہے۔کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں کہ ہم کون ہیں؟ کیا ہیں؟ تین میں ہیں یا تیرہ میں ہیں، ہیوں میں ہیں یا شیوں میں۔ گورا ہمیں گورا نہیں جانتا خواہ ہماری رنگت اس سے زیادہ ہی سرخ وسپید کیوں نہ ہو، جنوبی افریقہ میں الگ بنچ پر بٹھائے گا۔ کالوں میں ہماری گنتی ہوا کرتی تھی۔ وہ بھی اس لئے کہ اصل کالے اس وقت تک مارکیٹ میں نہ آئے تھے۔کل ہائیڈ پارک کارنر میں ایک افریقی سے ہم نے بھائی چارہ جتایا تو وہ بولا۔تم کس منہ سے خود کو کالا کہتے ہو۔ جاؤ اپنا منہ دھو رکھو۔اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اقوامِ عالم میں عزت کی جا پانے کے لئے اپنے چہرے پر کالک ملیں یا ملوائیں؟ اپنے ہونٹ موٹے اور آنکھیں باریک کرائیں؟ اپنی جلد پر سفیدی کا آرڈر دیں، ڈبل ریٹ پر خود کو دھوبی سے دھلوائیں۔ اپنی ناک پر پہیہ پھیرو دائیں یا پھر اپنا منبع ومخزن تلاش کریں اور سرخروئی کے ایسے سامان بہم پہنچائیں کہ سبھی ہمیں پلٹ کر دیکھیں، اور ہم پر رشک کریں۔

یارو! بڑائی رنگ اور نسل کی نہیں ہے۔قرونِ وسطیٰ میں لندن اور پیرس گمنام قریے تھے۔ گندگی کے ڈھیر تھے۔ پادری لوگ نہانے والوں کے کوڑے لگوایا کرتے تھے کہ یہ مسلمان ہو گئے ہیں جمعہ کے جمعہ نہانے لگے ہیں۔ 1868ء سے پہلے جاپان کا شمار دنیا کی قوموں

میں کہیں بھی نہ تھا۔ چینی ابھی کل تک آدھے افیمچی اور آدھے ڈاکٹر فومانچو تھے۔ اس سے بہت پہلے ایک زمانہ تھا کہ یون کے جھنڈے ہر طرف گڑے تھے۔ پھر رومنوں نے بادشاہی کی۔ عرب کیا تھا بس اک جزیرہ نما تھا۔ لیکن یہاں سے روشنی کی ایک مشعل چلی اور قرطبہ، بغداد، دمشق اور قسطنطنیہ کے مناروں سے دنیا بھر میں علم وتہذیب کا نور تقسیم ہوا۔ سو سب ملتیں اور رنگتیں یا زبانیں اور سرزمین اپنی ہمت اور اپنے اعمال سے سرفراز ہوتی ہیں۔ یہاں کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے۔ کسی فرقے یا فرد کی خلافت موروثی نہیں۔ ہم میں کیا نہیں ہے۔ ارض ہند کا نمک ہے۔ عرب کی صلابت ہے۔ ایران کی موزونیت ہے لیکن اے خامہ بے لگام اور طبع خود پسند! بس بس، اپنے دہی کو کون کھٹا کہتا ہے۔

برطانیہ کے لوگ آج کل ایک سرکاری رپورٹ سے یہ معلوم کر کے بلبلا اٹھے ہیں کہ ہر سال چھ ہزار دو سو سائنسدان، انجینئر اور تربیت یافتہ کاریگر انگلستان سے دوسرے ملکوں خاص کر امریکہ کی راہ لیتے ہیں کیونکہ وہاں ان کو تین گنا زیادہ تنخواہ مل جاتی ہے ایک انجینئر، سائنسدان یا کاریگر کی تربیت پر برطانیہ کا چھ ہزار پونڈ سے سولہ ہزار پونڈ تک صرف ہوتا ہے۔ امریکہ میں کسی کو تربیت دیں تو انہتر ہزار پونڈ خرچ کریں۔

یہ چیز جسے برین ڈرین یعنی تربیت یافتہ لوگوں کی ملک سے ہجرت کہا جاتا ہے۔ برطانیہ کے لیے اگر خطرہ ہے تو ہم ایسے ملک کے لیے جو ترقی یافتہ نہیں بلکہ ترقی کی راہ پر ہے مہا خطرہ ہے۔ پرسوں ایک پاکستانی بزرگ لندن سے گزرے، وہ ترک وطن کر کے مستقلاً کینیڈا جا رہے تھے اور بہت خوش تھے۔ کہتے تھے کہ پاکستان میں کیا دھرا ہے۔ کینیڈا میں موٹی تنخواہ ملے گی۔ اگر ملک پسماندہ ہے تو کیا ہم بھی پسماندہ رہیں؟ اگلی نسلوں کے فائدے کے لیے اپنا آرام اور اپنی امارت کے امکانات تیاگ دیں؟ ایک اور صاحب ہیں، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں۔ کوئی پندرہ سال سے یہاں پڑے ہیں ہم نے ان سے کہا یہاں کیا لذت ہے۔ چارٹرڈ اکاونٹنٹ ہیں۔ کوئی پندرہ سال سے یہاں پڑے ہیں۔ ہم نے ان سے کہا یہاں کیا لذت ہے۔ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تو پاکستان میں بھی عیش کرتے ہیں۔ یہاں گھر کے برتن تک دھوتے ہو۔ آج کل بیمار ہو کر اسپتال میں ہیں۔ معلوم ہوا کہ کوئی دیکھنے نہیں جاتا۔ ان ترقی یافتہ ملکوں میں سارے رشتے اقتصادی ہیں۔ بیوی بھی چند روز میں تنگ آ جاتی ہے۔ ہم ایسا حال نہیں کہ بیمار دوست بھی عیادت کو بھاگے جا رہے ہیں۔ کسمپرسی

www.pakistanipoint.com

کے عالم میں ان پر رقت طاری ہوئی تو ہم نے کہا: میاں نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا۔ وطن میں آمدنی چاہے اتنی نہ ہو لیکن اس میں اس سے زیادہ عزت اور آرام سے گزرے گی اور پھر اگر تم نے کچھ پڑھا لکھا ہے تو اس سرزمین کو بھی تو فائدہ پہنچاؤ جس نے تمہیں جنم دیا۔ آہ بھر کر رہ گئے۔ انگریز بیوی کر رکھی ہے اسے پاکستان کا گرد و غبار پسند نہیں۔

یہی بات ہم نے ایک ڈاکٹر سے کہی۔ بڑے ذہین آدمی ہیں۔ لندن سے باہر ایک شہر میں رہتے ہیں۔ ایم بی بی ایس لاہور سے کیا تھا۔ کہنے لگے۔ ہاں لاہور، لاہور ہے۔ یاد آتا ہے۔ اردو کی کتابیں رسالے بھی دیکھے ہوئے مدت ہوئی۔ اب تم نے دکھائے تو وطن کی سوندھی خوشبو آئی لیکن ہم نے یہ مانا رہیں دلی میں پر کھائیں گے کیا۔ اس کے بعد انہوں نے پاکستان میں ڈاکٹروں کے گریڈ بتانے شروع کئے۔ پاکستان میں اپنی ملازمت کے تجربے سنائے۔ ان کو ہم شافی جواب نہ دے سکے کیونکہ کچھ قصور ہمارا بھی نکلا لیکن ان ڈاکٹر صاحب کے نفع نقصان کو چھوڑ کر سوچا جائے تو کتنے لوگ ہمارے ملک کے قصبوں اور دیہات میں محض ڈاکٹر نہ ہونے سے اور طبی امداد نہ ملنے سے مر جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کینیڈا چلے جائیں تو فقیر کی چٹکی سے علاج کرنے والوں، طب چین و جاپان کے اشتہار دینے والوں اور مقناطیسی انگوٹھیوں اور کنگنوں والوں، عاملوں کاملوں، تعویذ گنڈے کرنے والوں اور فٹ پاتھ کے پروفیسروں کی کیوں نہ چاندی ہو۔ ہم نے چین میں ایک ڈاکٹر سے کہا تھا کہ تم یہاں دو سو روپلی ماہوار لے کر کیا کر رہے ہو، کینیڈا چلے جاؤ۔ دس ہزار روپے ملیں گے، مسکرا کر کہنے لگا کہ میاں روپیہ ہی تو سب کچھ نہیں ہے اگر میرا ملک کنگال ہے تو میری امیری کس کام کی۔ چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو۔

ہمارے ملک میں جو لوگ مزدوری پیشہ ہیں۔ کوئی ٹیکنیکل مہارت نہیں رکھتے۔ وہ شوق سے دوسرے ملکوں میں جائیں۔ اپنی حالت سدھاریں۔ کمائیں گے تو ان کا کچھ پیسہ زرمبادلہ کی صورت میں ملک میں بھی آئے گا۔ لیکن ڈاکٹر، انجینئر، سائنسدان تو ہمارے ہاں لاکھوں میں ایک نکلتا ہے۔ وہ بھی ہمارے ہاتھ اور ہمارے ساتھ نہ رہا تو یہ چار سالہ اور پنج سالہ منصوبے آپ کیسے پورے کریں گے۔ پھونک مار کر تو کارخانہ نہیں بنایا جا سکتا نہ امام ضامن باندھ کر اسے چلایا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگوں کو باہر جانے کا یوں بھی شوق ہوتا ہے۔ ہمارے ایک دوست جنہوں نے نہایت اعلیٰ تعلیم پائی تھی۔ یہاں لندن میں کچھ دن ایک ہوٹل میں بیرے رہے۔ پھر ایک جگہ چوکیداری کی۔ بس کنڈکٹر بھی رہے۔ آخر وطن واپس

www.pakistanipoint.com

چلے گئے۔ پرسوں ایک پاکستانی بیمہ کمپنی کے لندن دفتر کے منیجر سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا میں نے تو سارا عملہ پاکستانی رکھا ہے۔ ہم نے کہا، ساتھ لائے ہوں گے آپ۔ جیسے سرسید اپنے نوکر کو ساتھ لائے تھے۔ کہنے لگے جی نہیں۔ ایک مثال سنیے: میں یہاں ایک پاکستانی ہوٹل میں کھانا کھانے جایا کرتا تھا۔ ایک بیرا مجھے دوسروں سے زیادہ شائستہ معلوم ہوا۔ اس کی انگریزی بھی بامحاورہ تھی۔ میں نے پوچھا۔ پاکستان میں کیا کرتے تھے بولا: راجشاہی یونیورسٹی میں لیکچرر تھا۔ موصوف ایم کام کا امتحان پاس کئے ہوئے تھے۔ کسبِ کمال کر کے اب گاہکوں سے ٹپ لیتے تھے اور ان کو تھینک یو کہنے پر مجبور تھے۔ میں نے کہا۔ ہماری بیمہ کمپنی میں نوکری کرو گے؟ بولا ضرور کروں گا۔ بلا تنخواہ بھی کروں گا۔ مجھے یہ کام سکھا دیجیئے۔ میں نے اسے اگلی صبح آنے کو کہا اور اب وہ میرے ہاں خاصا کام کر رہا ہے۔ کوئی دن میں آفیسر گریڈ میں چلا جائے گا۔

اگر یہ بات ایثار کی ہے تو یہ ایثار کہیں سے تو شروع ہونا چاہیے۔ اوپر سے نہیں تو نیچے سے۔ نیچے سے نہیں تو اوپر سے۔ بات پھر چین کی آ گئی۔ کتنے ہی چینی انجینئر اور سائنسدان جو امریکہ اور یورپ میں بیش قرار آمدنی کے مالک تھے۔ اس پر لات مار کر اپنے وطن آ گئے وہاں جیسی دوسروں کی اوقات ویسی ان کی۔ بنک بیلنس بیشک نہیں ہیں، نہ لمبی کاروں کی ریل پیل ہے نہ اونچے محل حویلیاں ہیں لیکن مزے سے گزر کرتے ہیں۔ تبھی تو ان لوگوں نے ہائیڈروجن بم بنالیا۔ ہم زیادہ سے زیادہ تانگے کا بم بنا سکتے ہیں۔

یہ ملک برطانیہ عظمیٰ۔ ہمارا پرانا آقا جس کے قدموں تلے کبھی دھرتی دہلتی تھی۔ آج کامن مارکیٹ کی ممبری کے لئے عرضیاں دیتا پھرتا ہے اور فرانس جیسے ملک اسے دھتا بتاتے ہیں۔ لندن کے چہرے کا فروغ اگر قائم ہے تو ٹورسٹوں کے بل پر۔ یہاں کے بڑے بڑے اسٹوروں کے خریدار یہاں کے مقامی لوگ نہیں بلکہ سیر و سفر پر باہر سے آئے ہوئے لوگ ہیں۔ خود ہم نے ایک دکان سے آٹھ دس ٹائیاں خریدی ہیں۔ ایک جگہ سے سوٹ خرید کر برطانیہ کی معیشت کو تھوڑا استحکام بخشا ہے۔ اور اس ملک کی مزید مدد کے لئے کل ایک ساتھ کئی جوڑے جرابوں کے اور ایک جوتا خریدنے کا ارادہ ہے۔ کیا کریں اس ملک سے ہماری پرانی سیاسی اور ثقافتی یاد اللہ ہے۔ مصیبت کے وقت ہم اس کے کام نہ آئیں گے تو اور کون آئے گا؟

www.pakistanipoint.com

www.pdfpoint.com

بیان لذتِ آوارگی کا

لندن میں آج کل ہپی لوگوں HIPPIES نے زور باندھ رکھا ہے۔ یوں تو یہ خدائی خوار کہاں نہیں ہیں لیکن لندن ان کو زیادہ مرغوب معلوم ہوتا ہے۔ یہاں پکاڈلی سرکس اور ٹریفالگر سکویر ان کے خاص ٹھکانے ہیں۔ اتوار کی شام ہائیڈ پارک پر بھی یورش کرتے ہیں۔ بال الجھے کپڑے چیکٹ، داڑھیاں پریشان، پاؤں رکھتے ہیں کہیں اور کہیں پڑتا ہے۔ زیادہ تر جوڑے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی، گلوں میں گھنٹیاں، ہاتھوں میں پھول، گل ہائے محبت، مانگتے ہوئے، کھاتے ہوئے۔ جہاں جی چاہا پھسکڑا مار کر بیٹھ گئے یا لیٹ گئے۔ بجھے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑے اٹھا کر پینے لگے۔ کسی نے پھولدار چھینٹ کا فرغل پہن رکھا ہے۔ کسی نے روئی کی بنڈی۔ گلے میں مالا بھی ہے اور آنکھوں میں مستی بھی۔ شراب کی سی نہیں، چانڈو کی سی۔ بہت سے عذر مستی بھی رکھتے ہوں گے۔ توجہ طلبی کے لئے بھیس بنا رکھا ہوگا۔ لیکن زیادہ تر کی وارستگی اصلی معلوم ہوتی ہے۔ آپ اسے ذہنی روگ کہہ لیجئے۔ لوگ انہیں دیکھتے ہیں اور مزے لیتے ہیں۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ان کی طرف کھنچتی بھی ہیں۔ بعضے ان پر نفرین کرتے ہیں۔ بعضے ہمدردی جتاتے ہیں۔ اچھے اچھے گھروں کی لڑکیاں ماری ماری پھر رہی ہیں۔ بعضوں کے نزدیک یہ اس معاشرے کا ردعمل ہے جو اس درجہ سرگشتہ خمارِ رسوم دقیود تھا کہ باپ گھر کے اندر بھی شام کو کھانے پر بیٹھتا تھا تو باقاعدہ ڈنر جیکٹ زیب تن کر کے۔ عہد وکٹوریا کی اخلاق پرستی مشہور ہے۔ ہم نے اس صدی کے آغاز کے لباس میوزیم میں دیکھے۔ عورتیں یہ لمبے لمبے لہنگے پہنتی تھیں۔ گلے کے اوپر تک بٹن بند

www.pakistanipoint.com

رہتے تھے اور پیراہن بھی خوب جھالر دار ہوتے تھے۔ سو وہ لباس قطع و برید کے بعد منی اسکرٹ تک پہنچا۔ یہی قطع و برید معیارِ اخلاق میں بھی ہوئی۔ پہلے زمانے میں سر بازار چوما چاٹی کا ایسا دستور نہ تھا۔ جیسا آج ہے۔ وہی لندن ہے جس میں آج ہپی لڑکے لڑکیاں اپنے کالروں پر یہ بیج لگائے پھر رہے ہیں۔

I AM FEELING SEXY (۔۔۔لینا کہ چلی میں)

I AM VIRGIN (میں کنواری ہوں۔ یعنی آ بیل مجھے مار)

I AM FOR FREEDOM OF SEX (اٹھا لے جو بڑھا کر ہاتھ)

I AM AN L.S.D.ADDICT (میں نشے میں ہوں)

I AM A PSYCHIATRIST LIE DOWN (میں نفسیات کا ماہر ہوں، سیدھی لیٹ جاؤ)

یہ بیج ڈیڑھ شلنگ میں ہر جگہ بکتے ہیں۔ پکاڈلی میں، ٹریفالگر، اسکوائر میں، ماربل آرچ پر، ٹاٹھنم کورٹ روڈ پر، گندے رہنا ان خانہ خرابوں کا شیوہ ہے، بعضے ننگے پاؤں رہتے ہیں۔ آنکھیں میلی، دانت میلے اور سر تو جھاڑ بنا ہوا۔ مردوں کی داڑھیاں ایک سے ایک نرالی دھج کی۔ داڑھی اب ولایت میں آوارگی کے سامان میں شامل ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں کہتے ہیں ''میاں داڑھی والے ہو کر یہ حرکتیں کرتے ہو''۔ یہاں یہ کہا جاتا ہے۔ ''داڑھی منڈے ہو کر یہ آوارہ پن؟ شرم تو نہیں آتی''

جو لوگ ذرا پرانے خیال کے ہیں۔ دانتوں میں انگلیاں دابے کہتے سنائی دیتے ہیں کہ یہ کیسا زمانہ آن لگا ہے۔ کیوں ان چھوکریوں کے دیدے پٹم ہو رہے ہیں۔ ڈیلی ٹیلی گراف میں ڈگلس کلیورڈن نے ایک مضمون لکھا ہے۔ ''دوشیزگی کی حمایت میں'' اس کا کہنا ہے کہ جنسی جذبات کا ابال تو ہمیشہ ہر زمانے میں عورت مرد میں اٹھتا رہا ہے۔ لیکن اگلے زمانے میں بے راہ روی کے مواقع کم تھے۔ اب تو خود کمانے والی لڑکیاں آزاد ہیں۔ ان پہ کوئی چاہے بھی تو کیسے پہرہ رکھ سکتا ہے۔ ہر آفت سے بچانے کے لیے گولی ہے۔ تحریص کے لئے

www.pakistanipoint.com

موٹر سائیکل ہے۔ اسپورٹس کار ہے۔ بوائے فرینڈ کے ساتھ گھر سے بلکہ ملک سے باہر جا کر چھٹی منانے کی آزادی ہے۔

گر ہو شراب و ساغر و محبوب خوبرو
زاہد تجھے قسم ہے جو تُو ہو تو کیا کرے

ادھر نوجوانوں کے لئے بے شمار مواقع ہیں کسی بھی دوشیزہ کو اپنی راہ پر لانے کے۔ بس ذرا تیکھی مونچھیں ہوں۔ روپے پیسے کی بھی شرط نہیں۔ کیونکہ لڑکی خود کماتی ہے۔ ادھر لڑکی کو روکنے والی کوئی چیز نہیں۔ دوسروں کو دیکھ دیکھ کر اس کی ذہنی کیفیت ایسی ہوگئی ہے کہ اگر کوئی پیار کرنے کے لئے اس کا طالب نہیں ہوتا تو وہ نِکّو بنتی ہے۔ خود کو ہم چشموں کی نظر میں حقیر محسوس کرتی ہے۔ جہاں سات سہیلیاں ملتی ہیں اور اپنے معاشقے بیان کرتی ہوں وہاں اس کا احساس کمتری میں مبتلا ہونا قدرتی بات ہے۔

کلیورڈن صاحب نہ وعظ کرتے ہیں نہ قرب قیامت کی نوید دیتے ہیں۔ ان کی دہائی یہ ہے کہ یارو کچھ لڑکیاں تو ایسی ہوں گی جو اپنی عصمت بچانا چاہتی ہوں گی اور شریفانہ شرطوں یعنی شادی کا انتظار کرنا چاہتی ہوں گی۔ پرانے زمانے میں ایسی لڑکیوں کو اس خیال سے تقویت رہتی تھی کہ معاشرے کا اخلاقی ضابطہ ان کی پشت پر ہے۔ ان کو بنظر تحسین دیکھتا ہے۔ آج ایسی کوئی روک نہیں۔

معاشرہ انہیں سراہے گا تو کیا، عجیب نظر سے دیکھتا ہے کہ یہ کیسی لڑکی ہے۔

یہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا، اس زمانے میں

Are We the Last Married generation

سنڈے آبزرور نے بھی ایک لمبا چوڑا مضمون چھاپا ہے۔ کیا شادی کا رواج ہماری نسل کے ساتھ ختم ہو جائے گا؟ یعنی آئندہ لوگ رہا کریں گے میاں بیوی کی طرح لیکن شادی کی کھکھیڑیں اٹھائے بغیر۔ آبزرور نے آنے والے دور کی دھندلی سی یہ تصویر دکھاتے ہوئے اس کی وجہ بیان کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شادی کی جاتی تھی معاشرتی اور اقتصادی تحفظ کے

www.pakistanipoint.com

لئے۔عورت شادی نہ کرتی تو کھاتی کہاں سے؟ شادی کے تصور کو کچھ تقویت مذہب سے ملتی تھی اور کچھ رومانی ناولوں سے۔اب لوگوں کی عمریں لمبی ہوگئی ہیں۔ایک ساتھی کے ساتھ اتنی بڑی جنسی زندگی گزارنا دشوار ہے۔لڑکے لڑکیاں اب بلوغت کو بھی جلد تر پہنچتے ہیں اور شادی سے پہلے جنسی تجربہ اب ایک قدرتی اور مسلمہ بات گنی جاتی ہے۔ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے جو شادی کے بعد مکمل جنسی وفاداری کی نہ توقع کرتے ہیں نہ اسے اہم جانتے ہیں۔اب شادی عورت کا معاشی سہارا بھی نہیں۔وہ خود جو کماؤ ہے۔نئے واعظین اخلاق (الیکس کمفرٹ وغیرہ) کا کہنا ہے کہ ایک مرد یا عورت اپنے شریکِ زندگی کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے سے بھی مخلصانہ محبت کرسکتا ہے یا کرسکتی ہے۔اس میں بے وفائی کی کوئی بات نہیں۔دونوں سے وفا ممکن ہے۔ظاہر ہے ان واعظین کے تصورِ عشق میں جنسی واردات بھی شامل ہیں۔

اس سلسلے میں آبزرور کے مضمون نگار نے بہت سے جوڑوں سے انٹرویو بھی لئے۔ان میں ایک صاحبہ ویلری ہاورتھ بھی ہیں۔عمران کی چوبیس برس ہے اور ایک بچہ ہے پانچ سال کا۔ایک دفتر میں سیکرٹری ہیں۔شادی ان کی اب تک نہیں ہوئی۔ان کا کہنا ہے کہ میں 19 برس کی تھی جب اسٹیوارٹ پیدا ہوا۔میں نے گھر سے بھاگ کر نوکری کرلی، اور اب ایک لڑکی کے ساتھ ایک فلیٹ میں رہتی ہوں۔میں نے اسٹیوراٹ کے باپ سے شادی کرنے کا کبھی سوچا بھی نہیں۔وہ اچھا شوہر بھی نہ ثابت ہوتا۔کبھی بچہ پوچھتا ہے کہ ''امی میرا باپ کوئی کیوں نہیں''؟ میں جواب دیتی ہوں اس لئے کہ ''امی نے شادی ہی نہیں کی۔'' وہ مطمئن ہوجاتا ہے۔میرے بوائے فرینڈز سے وہ خوب گھلا ملا رہتا ہے۔ایک روز بس میں ایک عورت نے کہا۔کتنا پیارا بچہ ہے بیٹے تمہارے ابو تو تم پر بڑا ناز کرتے ہوں گے''۔اسٹیوارٹ نے جھٹ کہا ''میری امی کی شادی ہی کہاں ہوئی ہے۔'' وہ بیچاری صدمے سے بے ہوش ہوتے بچی۔

مس ہاورتھ کہتی ہیں کہ میں اپنی زندگی سے ناخوش نہیں۔میرے مرد دوستوں کی طرف سے دوبار مجھے شادی کی پیش کش بھی ہوچکی ہے۔میری وہ سہیلیاں جو جلدی میں شادی کر بیٹھیں میری زندگی پر رشک کرتی ہیں۔

www.pakistanipoint.com

پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق۔ مغرب میں تو محبت اور شادی دونوں کا بولو رام ہوا جاتا ہے۔ امریکن پرچے اسکوائر میں درجنوں ایسے یونیورسٹی کے طالب علم جوڑوں کی تصویریں چھپی ہیں جو بن بیاہے میاں بیوی کی طرح رہتے ہیں۔ اب ادب میں بھی گالز دردی کے سیب کے درخت کی ہیروئنیں نہ ملیں گے۔ وفا میں گھل گھل کے مرنا جینا دونوں متروک ہوئے۔

ترے کوچے ہر بہانے ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

مغرب والوں کے نزدیک یہ شعر بے معنی ہے۔ آج کے شاعر کا چاند بالائے نام نہیں ہے اس کے پہلو میں ہے نہ عہد و پیماں نہ شکوے شکایت۔ نہ بے مہری جاناں نہ سیاستِ درباں۔ ہپی لوگ ذرا زیادہ انتہا پسندانہ مظاہرہ سہی لیکن سارے آوے کا یہی حال ہے۔

ہپی یورپ میں تو اب ایجاد ہوئے ہمارے ہاں صدیوں سے چلے آ رہے ہیں۔ ہم ناحق ان کا تماشا کرنے اتنی دور آئے۔ پکاڈلی سرکس میں اپنی شامیں خراب کیں۔ یہ پریشاں گیسوؤں، لمبے چوغوں، جھالر دار داڑھیوں، میلے کرتوں اور لمبی مالاؤں منکوں، کشکولوں، گھنٹیوں، ناقوسوں، تعویذوں والے ہمارے ہاں کیا کم ہیں۔ اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے۔ کس چیز کی کمی ہے۔ مولا مری گلی میں بھنگ گھٹتی ہے، چانڈو کا دم لگتا ہے، کونڈی سونٹے کے گھنگرو بجتے ہیں، سبزی کے جام تقسیم ہوتے ہیں۔ ہو حق، ہو حق، لگے دم مٹے غم۔ شاعر نے ان مچھندروں کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

پھرتے ہیں یوں شہر کے اندر
آگے کتے، پیچھے بندر
دم مولا دم مست قلندر

ان میں بعضے بے اولادوں کو اولاد بخشتے ہیں۔ عذر مستی رکھ کر ننگ دھڑنگ پھرتے ہیں۔ پھونکیں مار کر مقدمے جتاتے ہیں۔ بعضے تو ہنڈیا میں ڈال کر روپے بھی دگنے کر دیتے ہیں۔ سرکاری ٹکسال یا اسٹیٹ بنک جانے کی حاجت ہی نہیں۔

www.pakistanipoint.com

ہر دور اور ہر زمانے کا ایک فلسفہ ہوتا ہے۔ جب تک انسان پتھر پر پتھر مار کر آگ سلگاتا تھا اور سموچے ہرن یا بیل کو آگ پر بھونتا تھا، یہ ایٹم بم، کمپیوٹر اور غیر ملکی زرمبادلہ کے ٹنٹے نہیں تھے۔ تب تک ہر جگہ امن اور شانتی تھی، لوگ مراقبوں میں جاتے، تپسیا کرتے اور اپنی ذات کو رفعت بخش کر بڑے اطمینان سے اپنی اپنی قبر میں چلے جاتے۔ پھر بقول استاد ذوق: خط بڑھا، زلفیں بڑھیں، کاکل بڑھے، گیسو بڑھے یعنی آبادی بڑھی۔ حرص بڑھی۔ جوع الارض بڑھی۔ لوگوں نے علم سے کار ابلیسی لینا شروع کیا۔ اور بات تیر و تبر سے ہوتے ہوئے ہائیڈروجن بم اور میزائلوں تک پہنچی۔ تپسیا اور اعتکاف کے زمانے گئے۔ اب کسی آدمی کی ذاتی نیکی اور تقشّف بے معنی چیز ہیں۔

ع: موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

ایک یورپین ایک روز ہماری روحانیت کی تعریف کر رہا تھا، ہم نے کہا، اے بھیا ہمارے ساتھ سودا طے کر لے۔ یہ روحانیت تو لے لے۔ ہم تجھے اپنے صوفی بھی بخشتے ہیں، تصوف کی دولت بھی تیری نذر ہے۔ ہمارے ہاں شاعر بھی بڑا بڑا پڑا ہے۔ وہ بھی سپرد م بتو مایہ خویش را۔ یہ سب لے کے تو اپنی روح کی پاکیزگی کا اہتمام کر۔ اتنے میں ہم تیرے ٹریکٹر، تیری ملیں، تیری حرفتیں، تیرے ٹیکنیکل کالج اور تیرا زرمبادلہ استعمال کرتے ہیں۔

ہمارا نسخہ مشرق و مغرب کو حتی الوسع ہم سطح کرنے کے لیے یہی ہے کہ ہم اپنا تصوف مع قوالوں کے اور اپنی شاعری مع اس کے سوز و گداز کے ایکسپورٹ کریں اور سائنس اور ٹکنولوجی درآمد کریں۔ کچھ ان لوگوں کی رفتار سست ہو کچھ ہماری تیز ہو۔ جب برابر آ جائیں گے تو سوچیں گے کہ اب کیا کرنا ہے۔ حضرت حفیظ جالندھری نے فرمایا ہے۔

ہاں ملے غیر کو بھی درد کی دولت یا ربّ
ایک میرا ہی بھلا ہو مجھے منظور نہیں

www.pakistanipoint.com

لغاتِ عاشقاں سے گھمکول شریف تک

جانے لوگ ان گلیوں کوچوں کے نام گارڈن بلکہ گارڈنز کیوں رکھتے ہیں۔ جہاں ایک پتی سبزے کی نہیں ہوتی۔ کوئنز گارڈن کے سامنے تو خیر باغیچہ ہے۔ خاصا بڑا ہے۔ ہمارے گھر کے لان سے بھی بڑا، لیکن پورچسٹر گارڈن وغیرہ نام تو لوگوں کو سبز باغ دکھانے کو رکھے گئے ہیں۔ ایک اور بات یہ کہ ہمارے ہاں پارک چھوٹی سی چیز ہوتی ہے، جیسے اورنگ زیب پارک۔ اسا سنگھ پارک وغیرہ لیکن گارڈن بڑا ہوتا ہے۔ برنس گارڈن، لارنس گارڈن وغیرہ۔ یہاں اس کے اُلٹ ہے۔ یہاں پارک بڑے ہوتے ہیں۔ مثلاً ہائیڈ پارک، ریجنٹ پارک وغیرہ۔ جانے کیوں یہ الٹی گنگا بہائی گئی ہے۔ پھر یہاں کے پتے پریشان کرتے ہیں۔ ایک نام لے لیجئے مثلاً لینسٹر، ایک تو لینسٹر روڈ ہوگی، پھر اس میں لینسٹر گارڈن ہوگا، لینسٹر اسٹریٹ ہوگی، لینسٹر پلیس ہوگا، لینسٹر سکویر ہوگا، لینسٹر یارڈ، لینسٹر وے، لینسٹر گرود، لینسٹر میوز بھی وہی جو پرانے زمانے کے اصطبلوں کی کٹڑیاں بنالی گئی ہیں اور اس پر اکتفا نہیں اس میں کوئی بھلا مانس اپنے مکان کا نام لینسٹر بلڈنگز رکھ لے گا۔ لینسٹر کیفے، لینسٹر لاج، لینسٹر ہاؤس وغیرہ ہمیں ایک جگہ واردک گارڈنز کا پتہ دیا گیا تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ہر طرف واروک ہی واروک ہے کوئی ایونیو ہے تو کوئی یارڈ ہے، کوئی اسکویر ہے، تو کوئی گارڈن ہے۔ جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔ قیامت یہ ہوئی کہ داروک گارڈنز ہیں۔ ایک لندن w2 میں یعنی ہمارے قریب، ایک لندن W 14 میں خاصی دور۔ آخر تھک ہار کر ہم واپس آ گئے۔ پیرس میں بھی ایونیو بولوار۔ پلیس وغیرہ کے چکر بہت ہیں۔ اور ہمارے ہاں بھی روڈ، اسٹریٹ، بازار کوچہ، گلی وغیرہ کا سلسلہ ہے لیکن انگریزوں کا مقابلہ

www.pakistanipoint.com

نہیں۔خدا جانے یہ لوگ اپنے گھر کیسے تلاش کرتے ہیں۔

واٹرلو اسٹیشن کے بکسٹال پر ایک کتاب بک رہی ہے۔

THE LOVE DICTIONARY(لغاتِ عاشقاں)

بعد میں یہی کتاب لندن کے مشہور اور دعوے کے مطابق دنیا کے سب سے بڑے کتب فروش فوال کے ہاں بھی پائی۔ یہ ایک ہدایت نامہ ہے۔ ورغلاہٹ SEDVICATION کے لئے سرورق پر جابجا ہونٹوں کے بوسوں کے گلابی نقوش ہیں اور اندر گفتگو کی صورت میں ٹوٹکے دیئے گئے ہیں، پانچ مختلف زبانوں میں۔اس کتاب کی مدد سے انگریزی،فرنچ،جرمن،اٹالین اور ہسپانوی زبان میں کسی اجنبی لڑکی سے اظہار عشق کیا جاسکتا ہے۔اس کا جواب حسبِ مراد ملتا ہے یا چپل سے مرمت ہوتی ہے۔اس کی ذمہ داری مصنف قبول نہیں کرتا۔نمونہ کلام:

جہاز میں سفر کرتے ہوئے:

''ارے میں کہاں آ گیا۔ مجھے سوتے میں چلنے کا مرض ہے''۔

میرے کیبن سے سمندر کا نظارہ زیادہ اچھا ہوسکتا ہے۔

ہوائی جہاز میں:

''میں ذرا آپ کا ہاتھ پکڑلوں۔جب جہاز اڑتا ہے تو میں گھبرا جاتا ہوں''۔

''یہ سیٹوں کے درمیان کا ڈنڈا نکال لیں تو زیادہ آرام رہے گا۔''

گاڑی میں:

''بتی بجھادوں؟ میری آنکھوں کو روشنی سے تکلیف ہوتی ہے''

معاف کیجئے۔یہ پانچ پونڈ کا نوٹ آپ کا معلوم ہوتا ہے۔

ساحل پر:

''ارے میں سمجھا آپ بے ہوش ہوگئی ہیں۔اس لئے مصنوعی تنفس دے رہا تھا۔''

www.pakistanipoint.com

''میں آپ کے تیراکی کے سوٹ میں سے ریت نکال دوں؟''

''میں تولیہ پکڑ کر آڑ کرتا ہوں آپ کپڑے بدل لیں.....''

سینما میں:

''سب سے پچھلی سیٹ پر بیٹھیں۔ وہاں سے اچھا نظر آتا ہے۔''

''اوہ میں سمجھا یہ میری کرسی کا ہتھا ہے۔''

''میرا دستانہ آپ کی ٹانگوں کے آس پاس گر گیا ہے۔''

اپنے فلیٹ میں:

''میں بتانا بھول گیا تھا کہ میرے والدین یکا یک گاؤں چلے گئے ہیں''۔

''پتہ نہیں بلب کا فیوز کیسے اُڑ گیا''۔

''یہ کمرے کا تالا کیوں جام ہو گیا''۔

اس کے فلیٹ میں:

''تھک گیا ہوں۔ ذرا لیٹ جاؤں۔ آپ بھی یہاں آرام کر لیجئے۔''

(اُس کا میاں آجائے تو)

میں بجلی والا ہوں۔ میٹر دیکھنے آیا تھا۔''

ہوٹل میں۔

(لفظ کوئی بھی فحش نہیں لیکن کوئی فقرہ نقل نہیں کیا جا سکتا)

اس کی والدہ سے:

''میں نہیں مانتا آپ اس کی والدہ ہیں۔ اس کی بہن ہوں گی آپ.....''

(پیچھا چھڑانا ہو تو) ''معاف کیجیے میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ میری بیوی اس پر رضامند نہ ہوگی۔''

کچھ مفید مطلب کلمات

www.pakistanipoint.com

''تم اتنی خوبصورت ہو کہ میں تنہائی میں اپنے پر اعتبار نہیں کر سکتا.....اے میری زندگی کی روشنی، اے ملکوتی چہرے والی، تمہارا حسن پاگل کر دینے والا ہے۔''تم دوسری عورتوں سے الگ ہو''.....رسموں کے جھگڑے میں نہیں پڑا کرتے۔''

ساؤتھ کنسنگٹن میں پرانی کتابوں کی ایک دکان پر ایک صدی پہلے کا ایک پرچہ نظر آیا۔

TEASING MADE EASY (ادا کیسے دکھائی جائے)

عورتوں کے لئے نصیحت نامہ:

تصویروں (کارٹونوں) کے نیچے عبارت ہے:

''عورت کو چاہیے کہ ایک دن بے حد اشتیاق ظاہر کرے۔ دوسرے دن چہرے پر تیوری چڑھا لے اور اپنے کو دور کھینچے۔ بے رخی سے جواب دے لیکن اس بیچ میں ایک نظر محبت بھری بھی ڈالے۔ رخصت کے وقت کہے۔ خدا حافظ اے ظالم۔ اگلی صبح وہ ضرور آئے گا۔ اس وقت ٹسوے بہائے۔ اس کی بانہوں میں خود کو ڈال دے وہ خود اپنے ناکردہ گناہ پر نادم ہوگا، اور معافی چاہے گا۔ اس وقت معافی دے دینی چاہیے.....وغیرہ

انگریزی اخبار کے اشتہارات کے کالم میں سے:

''سینکڑوں برطانوی اور غیر ملکی لڑکیاں دوستوں کی متلاشی ہیں۔ پتہ ذیل پر خط لکھئے:۔

گلوبل۔52 ارلز کورٹ روڈ۔لندن

رومانس لڑائیے یا شادی کیجئے۔لڑکیوں سے ملانا ہمارا ذمہ۔ ہر عمر کی ہیں اور خوبصورت

پتہ: الفا:30 بیکو اسٹریٹ۔لندن

ہمارے کلب کی خواتین ارکان کے لئے مردوں کی ضرورت ہے۔

پتہ:74۔امہرسٹ پارک۔لندن

''آپ امید سے تو نہیں ہو گئیں؟ ہم سے معائنہ کرائیے۔فیس و دپونڈ۔معاملت صیغہ

www.pakistanipoint.com

TEASING MADE EASY.

ADVICE TO LADIES.

HOW TO TEASE THE GENTLEMEN.

HOW TO GET A LOVER.

LOVE, COURTSHIP, & MATRIMONY.

راز میں رہے گی"۔ پتہ۔ بیل جنکٹر 4۔ چارلٹ روڈ۔ لندن

25 سال کے ایک نوجوان کو عورت چاہیے۔ 25 سے 44 سال تک کی۔ کنواری ہو، بیوہ ہو، طلاق یافتہ ہو، کچھ پروا نہیں، مقصود دوستی ہے۔

بکس نمبر 351

برطانوی کنوارا عمر چالیس سال، کسی ہندوستانی، ایشیائی، ایفرو ایشیائی لڑکی سے دوستی چاہتا ہے۔ عمر 35 تا 45 سال قابلِ قبول ہے۔

ایک خانقاہ کا تربیت یافتہ پادری عمر 29 سال، اعلیٰ ڈگری یافتہ، شرمیلا، ایسی عورت سے جھٹ پٹ یارانہ چاہتا ہے جو راز کو راز رکھے۔

اور دوسرے سرے پر:

لندن کے ایک اردو اخبار میں اطلاع عام:

کاؤنٹری (انگلستان) گھمکول شریف کوہاٹ کی خانقاہِ نقشبندی کے سالانہ عرس کے

www.pakistanipoint.com

موقع پر 8 اکتوبر کو صبح دس بجے جامع مسجد کاونٹری واقع ایگل اسٹریٹ میں ایک روحانی تقریب منائی جائے گی۔ جس میں نعت خواں اور علمائے کرام شرکت کریں گے۔

سجادہ نشین آف موہڑہ شریف بھی عوام سے خطاب کریں گے۔ علاقہ کے مسلمانوں سے شرکت کی درخواست ہے۔

www.pakistanipoint.com

ہائے بشیرا، ہائے بشیرا

ہمارے دوست سید سبط حسن آج کل لندن میں ہیں۔ بابل نینوا اور بعلبک وغیرہ کے خرابوں کی خاک چھانتے یہاں پہنچے ہیں، معلوم ہوا کہ ٹیلی ویژن کے اشتہاری پروگراموں کی تکنیک کا مطالعہ کر رہے ہیں، ہم سے ملاقات ہوئی تو ہم نے پوچھا کہیے کیسی گزرتی ہے۔ بولے، بشیرا یاد آ رہا ہے، ہم نے کہا، یہ کون بزرگ ہیں؟ بولے، ارے بھائی اپنا بشیرا جو ہمارا حقہ بھرتا ہے، ہمارا بستر لگاتا ہے، ہمارا جوتا پالش کرتا ہے، علی الصبح چائے بنا کر دیتا ہے، ہمارے مہمانوں کے لیے پان سگریٹ لاتا ہے، دھوبی کے ہاں کپڑے دے کر آتا ہے اور پھر لاتا ہے، گھر کے لیے سبزی گوشت آٹا دال سبھی کا ذمہ دار ہے۔ ہمارے گھر میں اصل چیز تو وہی ہے ہم تو مدفاضل ہیں۔ ہمارے بغیر ہمارے گھر کا گزارا بخوبی چل سکتا ہے۔ بشیرا کے بغیر نہیں!

تب معلوم ہوا کہ اپنے ایک دوست کے ہاں مقیم ہیں اور اخلاقاً ہر روز صبح کو پورے گھر کے برتن دھوتے مانجھتے ہیں۔ یہ ان کا خاندانی پیشہ کبھی نہیں رہا۔ لہٰذا ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے ہیں ان پر تیل لگاتے ہیں اور ہاتھ سینکتے ہیں۔ چونکہ ان کے دوست ہسپتال چلے گئے ہیں لہٰذا انہوں نے فرمایا تمہارے پاس جگہ ہو تو ہم بھی آ جائیں۔ ہم نے کہا بسم اللہ۔

سید سبط حسن کے ہمارے مکان میں آ جانے سے پہلے ہمیں دھوبی نائی کی بڑی دقت تھی، اب نہیں رہی۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنے کام کے آدمی ہیں۔ ہم نے اپنے رومال اور ایک دو بنیائن دھونے کو نکالے تو بولے، کیوں اتنی زحمت کرتے ہو، میرے تھیلے میں

www.pakistanipoint.com

ڈال دیں، میں تھوڑی دیر میں گھاٹ پر جانے والا ہوں، ہم نے کہا۔ ''گھاٹ؟ آپ جا کر یہ کپڑے دھوئیں گے؟ چھوا چھو کریں گے؟'' انہوں نے کہا ''اس سے آپ کو کیا مطلب۔ آپ اپنے کپڑے اس تھیلے میں رکھیے اور میں یہ لادی لیے جاتا ہوں۔ دوپہر تک آپ کو دھلے دھلائے کپڑے مل جائیں گے۔

تب معلوم ہوا کہ وہ پڑوس میں ایک لانڈریٹ دیکھ آئے ہیں، یہ ایک دوکان ہوتی ہے جس میں کپڑے دھونے کی مشینیں قطار در قطار رکھی ہوتی ہیں۔ آپ خود ہی مشین میں کپڑے ڈالیے۔ صابن ڈالیے۔ مشین ایک ہینڈل گھمانے سے چلنے لگے گی۔ وہاں سے نکل کے دوسری مشین میں رکھیے اور ایک اکنی ڈالیے، وہ ان کو پوری طرح نچوڑ دے گی۔ تیسری میں ڈالیے تو چھ پنس میں سکھا دے گی۔ افسوس ابھی تک ایسی مشینیں نہیں نکلیں کہ چھ پنس کا سکہ لے کر کپڑے استری بھی کر دیں لیکن اس کے لیے سید صاحب ایک جیبی استری لے آئے ہیں۔ جب ذرا گردن جھکائی کپڑا استری کر لیا۔

کچھ دن سے ہمارے بال بڑھ رہے تھے سید صاحب نے کہا، تم نہ ہپی ہو، نہ انٹلکچویل ہو کہو تمہارے بال کاٹ دوں، لاہور میں شاکر علی ہمارے بال کاٹ دیا کرتے تھے ہم ان کے۔ ہم نے کہا شاکر علی صاحب کی اور بات ہے۔ ان کے سر پر بال ہی کتنے ہیں۔ مجھے معاف رکھیے، کسی نائی کا پتہ بتا دیجئے۔ تب انہوں نے ہماری رہنمائی کی پیش کش کی۔ ایک نائی کے ہاں لے گئے ہمیں اس کی کرسی پر بٹھایا اور خود اخبار پڑھنے لگے، لیکن ابھی سرخی آدھی ہی پڑھی ہوگی کہ نائی نے کہا ''بس جناب ہوگئی حجامت، اب لائیے چھ شلنگ دیجئے۔ ہاں صاحب! اب کس کی باری ہے؟ آئیے۔

ہماری حجامت ہونے میں محاورے کے لحاظ سے بھی اور ویسے بھی، دو منٹ سے زیادہ نہ لگے ہوں گے۔ اس بندہ خدا نے ایک کنگھا اٹھایا اور ایک بجلی کی مشین۔ شمع تک تو ہم نے بھی دیکھا کہ پروانہ گیا، پھر کچھ معلوم نہ ہوا، یہ بات ہمیں کچھ پسند نہ آئی کیونکہ آٹھ شلنگ جمع دو شلنگ بخشیش سے قطع نظر جو ہمیں طوعاً و کرہاً دینی پڑی اور جسے لے کر اس شخص نے

سلام تک نہ کیا، ہمیں یہ سب کچھ حجام کی دوکان کی روایت کے خلاف لگا۔ ہم نے الف لیلہ، میں بوبک حجام اور اس کے بھائیوں کے قصے پڑھ رکھے ہیں۔ ان کی نسل تو اب ناپید ہوئی تاہم کراچی میں جن خلیفہ کے آگے ہم سر جھکاتے ہیں وہ بھی کم از کم ہم سے عرب اسرائیل کے مسئلے، آٹے دال کے بھاؤ، نئی نسل کی بے راہ روی اور مذہب سے دوری اور روس اور امریکہ کے گٹھ جوڑ پر ضرور گفتگو کرتے ہیں۔ پیچھے کے بال مشین سے اور آگے کے قینچی سے کاٹتے ہیں۔ استرے سے قلمیں بناتے ہیں۔ پھر آگے پیچھے سے شیشہ دکھاتے ہیں، بالوں کی چمپی کرتے ہیں، کنگھا کرتے ہیں، ان کا ریٹ تو ایک روپیہ ہے لوگ چار آنے ٹپ بھی دے دیتے ہوں گے۔ لیکن سیر چشمی ہماری طبیعت میں داخل ہے اس لیے ہم بال کٹا کر اپنی جیب سے حاتم کی قبر نکال کر پہلے اسے ٹھوکر مارتے ہیں پھر اسے ڈیڑھ روپیہ دیتے ہیں۔ وہ خوش ہو جاتے ہیں اور دوہرے ہو کر سلام کرتے ہیں۔ اس لندن کے نائی نے تو ہمارے بال تک نہیں جھاڑے۔ ایک تولیہ ہماری طرف پھینکا کہ جھاڑ لیجئے۔

سید سبط حسن کو سوا در دمتہ الکبریٰ میں جو دلی یاد آئی یعنی لندن میں بشیرا کی قدر معلوم ہوئی تو اس کی وجہ یہی ہے کہ یورپ میں بشیرا قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ دفتر ہو یا گھر، آپ خود ہی اپنے چپراسی، خود ہی اپنے چوکیدار، آبدار، خاصدار، خانساماں وغیرہ اور گھر کی بی بی خود ہی اپنی آیا، چھوچک، مغلانی، انا، میراسن، دھوبن اور نائن ہوتی ہے۔ افسر خود ہی فائل پر جو کچھ لکھتا ہے لکھ کر دوسرے کمرے میں دوسرے اہل کار کو دینے جاتا ہے۔ گھر والا اور گھر والی دونوں اپنا سودا خود لاتے ہیں، خود پکاتے ہیں اور خود ہی برتن مانجھتے ہیں، جھاڑو دے کر گھر کی صفائی کرتے ہیں۔ اس برعظیم میں انگریز آتا تھا تو یہاں کی گرمی کے باوجود اگر واپس نہ جاتا تھا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ اس کے اشارے پر دس آدمی بکلوس باندھے خدمت کو بھاگے آتے تھے۔

سید صاحب کو ہم نے اپنا جوتا آپ پالش کرتے اپنے پائپ کی چلم آپ بھرتے اور اپنی قمیص کا بٹن آپ ٹانکتے اور اپنی پتلون پر استری کرتے دیکھا تو ہم نے ان سے باقاعدہ

www.pakistanipoint.com

معافی چاہی کہ ہم تو آپ کو بالکل ناکارہ آدمی سمجھتے تھے۔ آپ تو خاصے سگھڑ نکلے۔ معلوم ہوا پکانا ریندھنا بھی جانتے ہیں۔ کم از کم انڈے تل لیتے ہیں اور توس سینک لیتے ہیں۔ گھر کے کام کاج سے بخوبی واقف ہیں۔ اگر ان کی شادی نہ ہو چکی ہوتی تو ہم ان کے لیے کسی تعلیم یافتہ برسر روزگار لڑکی کا بر تلاش کرتے۔

سید صاحب کو سب سے زیادہ تکلیف صبح کی چائے یعنی بیڈ ٹی کی ہے۔ وہ صبح صبح اُٹھ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ سحر خیزی کی عادت کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ چرند پرند کی بات اور ہے ان کے تو بستر نہیں ہوتے اور پھر ان کو اٹھ کر چوگا بھی تلاش کرنا ہوتا ہے۔ انسان تو اشرف المخلوقات ہے۔ بستر رکھتا ہے۔ خیر تو سید صاحب اٹھتے ہی ہائے بشیرا کا نعرہ لگاتے ہیں اور کہتے ہیں مجھے دنیا میں اور کچھ نہیں بشیرا چاہیے۔ ان سے پہلے مرزا سودا بھی اپنے قصیدے میں حرص نامی شخصے سے کہہ چکے ہیں کہ دنیا کی ساری چیزیں تجھے مبارک، میں اور ساتھ میرے میرا بسنت خاں ہو۔ اب وہ جلد ہی کراچی لوٹنے والے ہیں اور ہمیں ان پر رشک آرہا ہے۔ یہ نظم بشیرا نامہ ہم نے انہی کے لیے کہی ہے۔ انہی کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔

بشیرا نامہ

ہم نے کل جب دل کو چیرا — صبر کا پایا ختم ذخیرہ
جیب میں بھی اب پونڈ نہ لیرہ — ہائے بشیرا، ہائے بشیرا
جب ہم دس کا نوٹ دکھائیں — تب اک گوشت کا ٹکڑا پائیں
وہ بھی اونٹ کے منہ میں زیرہ — ہائے بشیرا، ہائے بشیرا
ساڑھے چھ میں اک خربوزہ — آٹھ روپے میں آدھا چوزہ
ڈیڑھ روپے کا چھوٹا کھیرا — ہائے بشیرا، ہائے بشیرا
ہوٹل وٹل، ٹیکسیاں کاریں — سبھی ہماری کھال اتاریں

www.pakistanipoint.com

جان کے آغا خاں کا نبیرہ ہائے بشیرا، ہائے بشیرا
سات روپے میں بال کٹا کر گھاٹ پہ خود لادی لے جا کر
روئے بیٹھ کے بھگت کبیرا ہائے بشیرا، ہائے بشیرا
کون ہمارا شُو چمکائے، صبح سویرے چائے لائے
دل اپنا بے حد دلگیرا ہائے بشیرا، ہائے بشیرا
تن میں اپنے جان نہیں ہے منہ میں اپنے پان نہیں ہے
کیسا زردہ؟ کون خمیرہ؟ ہائے بشیرا، ہائے بشیرا
جان بچے تو لاکھوں پائیں خیر سے اب ہم گھر کو جائیں
دیکھ لیا یورپ کا وطیرہ ہائے بشیرا، ہائے بشیرا

لندن میں ہم رہے تو بہت دن لیکن ان میں سے آدھے سوٹ کیس کو چابی لگوانے اور آدھے جوتا گٹھوانے میں گزر گئے۔ چابی کا قصہ یہ ہے کہ سید سبط حسن کے ایک دوست اپنا سوٹ کیس جس میں ان کے پرانے میلے کپڑے بھرے تھے لندن چھوڑ گئے تھے اور سید صاحب سے کہہ گئے تھے کہ اسے بک کرا کے لیتے آنا۔ دیکھا تو اس کی چابی نہیں تھی اور تالا بند نہ ہو تو ایئر کمپنی والے سامان قبول نہیں کرتے۔ آخر انہوں نے سوٹ کیس ہاتھ میں اٹھایا اور چابی بنوانے کے لیے نکلے۔ بازار دو تین فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ کبھی اس ہاتھ میں لیتے وہ تھک جاتا تو دوسرے ہاتھ میں۔ ہمارے ایک ہاتھ میں ایک کتاب تھی اور دوسرے ہاتھ میں اس روز کا اخبار تھا۔ ورنہ ہم ضرور ان کا بوجھ بٹاتے۔ کوئنز وے پر اس سرے سے دوسرے سرے تک گھوم گئے۔ جانے یہ لندن والے کیسے لوگ ہیں۔ جوتے، کپڑے، بسکٹوں، مٹھائیوں، بجلی کے سامان، سگرٹوں اور الا بلا چیزوں کی دوکانیں تو بہت ہیں لیکن جو سب سے ضروری چیز ہے یعنی تالوں کی گمشدہ چابیاں بنانا، بس وہی نہیں ہے۔ ایک جگہ پوچھا تو دوکاندار نے بغیر ہماری طرف دیکھے ایک طرف کو ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا۔ ادھر چلے جایئے AROUND THE CORNER ہے۔ ہم اگلے موڑ پر گئے۔ وہاں

www.pakistanipoint.com

کوئی نشان نہ ملا۔ ایک سگرٹ فروش سے پوچھا۔ اس نے کسی اور طرف اشارہ کیا، اور کہا AROUND THE CORNER آخر ایک بڑے اسٹور میں گئے وہاں معلوم ہوا کہ KEY CUTTER یعنی چابی بنانے والا ہے۔ اس نے سوٹ کیس کو دیکھتے ہی سر ہلا دیا کہ جناب ایسی چابی نہیں بن سکتی۔ وہاں سے ہم انڈر گراؤنڈ ریل کے سٹیشن پر پہنچے اور آکسفورڈ سٹریٹ پر اترے۔ وول ورتھ WOOLWORTH کے ہاں دنیا بھر کی چیزیں اور دنیا بھر کے کام ہوتے ہیں۔ وہاں ایک سٹال پر لکھا تھا کہ یہاں تالے کی چابیاں بنائی جاتی ہیں اور جوتوں کی ایڑیاں لگائی جاتی ہیں۔ ہم نے کہا:

''حضرت اس کی چابی بنا دیجیے!''

اس نے کہا۔ ''جی مجھ سے نہیں بنے گی اس کی چابی..... میں تو مکانوں کے دروازوں کی چابیاں بناتا ہوں۔

ہم نے کہا۔ ''اچھا تو ہمارے جوتے کی ایڑی گھس گئی ہے یہ لگا دیجیے''۔

ہم نے سوچا بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی لیکن اس نے اس کے لئے بھی معذرت کر دی اور کہا کہ ایڑی تو کسی ورکشاپ ہی میں لگ سکتی ہے کسی جوتے والے کے ہاں جایئے۔

اب چابی کی طرف سے مایوس ہو کر ہم نے جوتے والوں کی دکانوں کے چکر کاٹنے شروع کئے۔ خدا خدا کر کے ایک موچی نے حامی بھری کہ ہاں بن جائے گی ایڑی لیکن تلا بھی گھس گیا ہے۔

''وہ بھی لگا دیجئے اور کل دے دیجئے کیونکہ ہم پرسوں جا رہے ہیں''۔

''لگ جائے گی۔''

''ہدیہ کیا ہوگا؟''

بولے۔۔۔ ''پچیس شلنگ گیارہ پنس۔'' (پاکستان والے بس اتنے ہی روپے سمجھیں) ہم نے جوتے کو گھما کر عین اس کی دوکان اور نظروں کے سامنے کوڑے کے ڈرم میں پھینک دیا اور تھیلے سے نکال کر دوسرا جوتا پہن لیا جو رستے سے خرید لائے تھے کیونکہ یہ

www.pakistanipoint.com

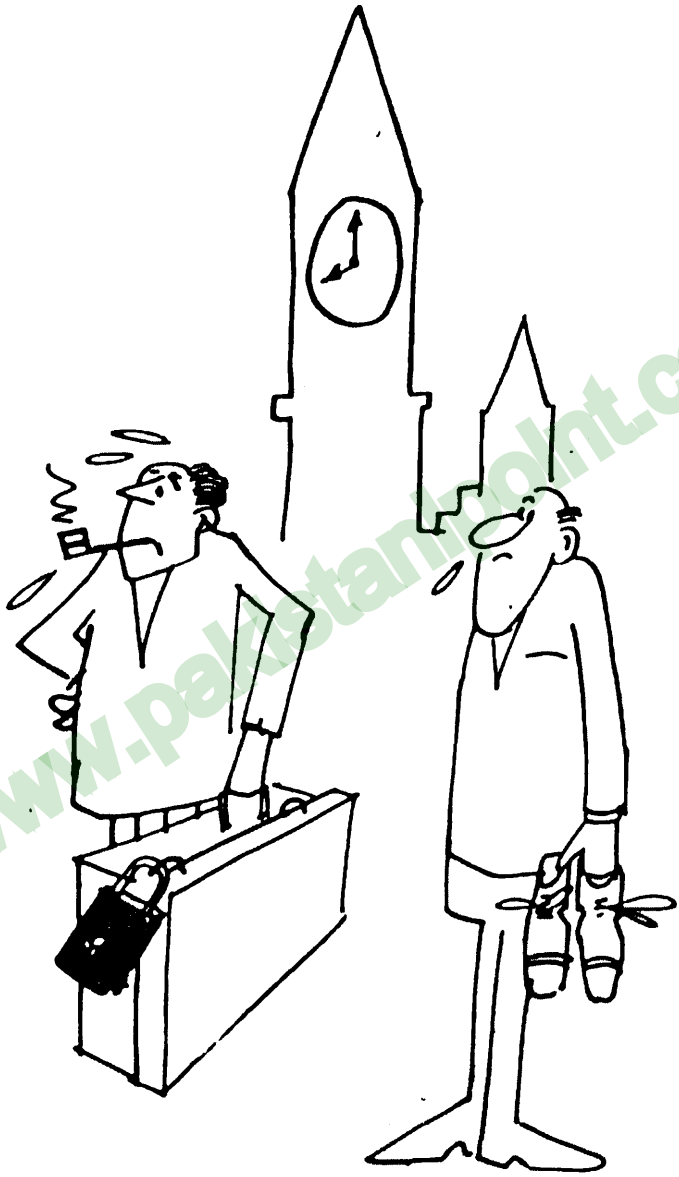

www.pakistanipoint.com

جوتا جو ہم نے پھینکا کراچی سے ٹھیک پچیس روپے گیارہ آنے میں لیا تھا۔

ہاں چابی کا مسئلہ بھی آخر حل ہوا۔ ہم نے کہا۔ ''ہمارے سوٹ کیس کا تالا بھی تو ایسا ہی ہے اور اس کی دو چابیاں ہمارے پاس ہیں۔ اسے لگا کر دیکھئے تو۔''

سید صاحب نے ڈرتے ڈرتے لگائی اور وہ کھٹ سے لگ گئی۔!

سید صاحب کو ہم نے گادر ملت کے علاوہ کولمبس وقت کا خطاب بھی دیا ہے انہیں ہمارے محلے میں آئے دو ہی دن ہوئے ہیں لیکن اب انگریز تک ان سے راستہ پوچھتے ہیں۔ ٹیوب سٹیشن سے ہمارے گھر کا نزدیک ترین راستہ بھی انہی نے دریافت کیا وہ تو عدیم الفرصت ہیں ورنہ کے ٹو وغیرہ سر کرنے کا سہرا بھی انہی کے سر ہوتا۔ ابھی کل ہی بات ہے کہ بیکر اسٹریٹ سے واٹرلو جاتے ہوئے ہم تین بار غلط گاڑی میں سوار ہوئے اور انہوں نے تین بار ہمیں زبردستی باہر نکالا۔ چند دن اور یورپ میں رہ گئے تو گائیڈ کا پیشہ اختیار کر لیں گے۔

www.pakistanipoint.com

جرمنی

12 اکتوبر تا 26 اکتوبر 1967ء

www.pakistanipoint.com

اب ہم فرینکفرٹ میں ہیں

انگریزوں کو دعویٰ تو انگریزی دانی کا ہے لیکن ڈھنگ سے بولنی نہیں آتی۔ ہمارے پلے بس ان کی آدھی بات پڑتی ہے۔ کبھی وہ بھی نہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ قسمت ہی تھی جو ہمیں لفتانزا کا جہاز مل گیا۔ ہم لدے پھندے لندن ایئرپورٹ کی عمارت پر انتظار کرتے رہے کہ اب ہانک پڑتی ہے۔ اس دوران مائیکروفون پر کچھ گنگناہٹ ضرور ہوئی لیکن ایسی کہ ہم نے اسے قابل اعتماد نہ جانا جب خاصی دیر ہوگئی تو ڈسک پر جا کر پوچھا کہ ''بی بی جی..... یہ جرمن ایئر لائن لفتانزا کا جہاز نمبر 223 جاتا کب ہے۔''

''کون سا جہاز؟'' بی بی نے پوچھا۔

''فرینکفرٹ والا''

بولیں۔ ''وہ تو چلا گیا۔ آپ کہاں تھے؟''

ہم نے بتایا کہ ''کافی پی رہے تھے''۔

اب وہ بچاری بھاگیں۔ بولیں۔ قاعدے سے تو چلے جانا چاہئے لیکن شاید ایک برآمد سے دوسرے میں، دوسرے سے تیسرے میں۔ مسافروں پر گرتے پڑتے۔ ایکسوزمی۔ ایکسوزمی کہتے کہتے ایک جگہ پہنچے جہاں مسافروں کو کوچ لے کر ہوائی جہاز تک جاتا ہے کیونکہ آخر لندن کا ٹریفک ہے جہاز اس عمارت سے کوئی پون میل دور اترتا ہے۔ ان لوگوں نے بھی کہا۔ آپ کی قسمت، کوشش کرتے ہیں۔ ایک شخص نے ہمیں اپنی جیپ میں بٹھایا اور ہری لال روشنیوں کی پروانہ کرتے ہوئے سرپٹ بھاگا ہمارے وہاں پہنچنے تک سیڑھی اٹھالی

www.pakistanipoint.com

گئی تھی لیکن ہم نے کہا۔ ''ارے ظالمو، جرمنو، کیا کرتے ہو؟ پھر لگاؤ سیڑھی۔ آخر ہم نے کرایہ دیا ہے۔ مفت تھوڑی جا رہے ہیں۔ ان کو ہمیں سوار کرتے ہی بنی۔ ورنہ ہمارا سامان جو پہلے ہی بار ہو چکا تھا۔ فرینک فرٹ چلا گیا ہوتا اور ہم خالی لندن میں ٹاپتے رہ جاتے۔

ایک ندی کے دو کنارے ملنے سے مجبور

ہوٹل زیپلن ..... سبحان اللہ کیا عمدہ ہوٹل ہے۔ یہ پہلا ہوٹل ہے جس کا غسل خانہ چھوٹا ہونے کی ہم شکایت نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے ساتھ غسل خانہ ہی نہیں۔ ہم نے آتے ہی منیجر صاحب سے کہا۔ ''یہ کیا غیر معقولیت ہے۔ آپ ہمیں کمرہ دیں یا نہ دیں، ہمیں غسل خانہ ضرور چاہیئے۔ ہم نہانے دھونے والے آدمی ہیں۔'' بولا ''جناب یہ بھی غنیمت جانئے کہ آپ کا پیغام ڈیڑھ مہینے پہلے مل گیا تھا اس لیے کمرہ آپ کے لیے ہم نے ریزرو کر دیا ورنہ فرینک فرٹ کتاب میلے کا رش ایسا ہے کہ کسی ہوٹل میں تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ آپ کے فلور پر ایک مشترکہ غسل خانہ ضرور ہے لیکن وہ ایک امریکن جوڑے نے ریزرو کر رکھا ہے وہ دو دن بعد چلا جائے گا تو شوق سے دن بھر ٹب میں بیٹھ کر اشنان فرمایئے گا۔''

''ٹائلٹ تو ہے نا؟ یعنی آپ ہمارا مطلب سمجھتے ہیں؟''

''جی ہاں وہ ہے اور منہ ہاتھ دھونے کے لیے آپ کے کمرے میں وہ چیز بھی ہے۔ آپ سمجھتے ہیں نا؟''

''جی جہاں۔ شکریہ!''

پیرس والے غسل خانے کا احوال ہم لکھ چکے۔ لندن میں مسز واٹسن کی سرائے میں جو گلوسٹر ہوٹل کے بھاری بھرکم نام سے معروف ہے۔ ہم دوسرے لوگوں سے ڈیوڑھا کرایہ دیتے تھے۔ کیونکہ اس کے ایک کونے میں شاور بھی تھا یعنی اس قسم کا ڈبہ جس کے اندر آدمی کھڑا تو ہو سکتا ہے لیکن ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتا۔ سید سبط حسن نے کہا ''میاں کیا کیا جائے۔ اوپر کا آدھا دھڑ تو نہا لیا ہوں، ٹانگوں پر صابن کیسے لگاؤں اور پانی کا تریڑا ابھی بس سر سے چھاتی تک آتا ہے۔

www.pakistanipoint.com

ہم نے کہا۔ یوگ ودیا سیکھی ہے آپ نے؟

بولے۔ ''ہاں کچھ کچھ تو پڑھا ہے''۔

''تو شیر شک آسن کیجئے۔''

''وہ کیا ہوتا ہے۔'' سید صاحب نے پوچھا۔

''سر کے بل کھڑے ہو جایئے اور ٹانگیں اوپر کھڑی کر لیجئے۔ پنڈت نہرو یہی کیا کرتے تھے۔ تبھی تو ان کو ہر چیز الٹی نظر آتی تھی۔''

''ان کا غسل خانہ بھی چھوٹا تھا کیا:

واللہ اعلم..... ویسے چھوٹا نہ ہوتا تو ان کو سر کے بل کھڑا ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ یا پھر پرانے زمانے کے شاعر کو چہ رقیب میں اس شان سے جاتے تھے لیکن نہرو جی شاعر تو نہ تھے اگرچہ شاعری کیا کرتے تھے۔

ہوٹل زیپلن میں بس یہ ایک تکلیف تو ہے اور تکلیف بھی کیا ہے۔ بھلا ہوا مری گگر یا ٹوٹی پانی بھرن سے چھوٹی۔ نہ نہانے کا معقول عذر مل گیا۔ مسلمان یوں بھی جمعے کے جمعے نہاتا ہے اور اگلے جمعے میں ابھی کئی روز ہیں۔ باقی ہر لحاظ سے یہ ہوٹل بہت آرام دہ ہے۔ مسز واٹسن کے ہاں ایک مہینہ گزارنے کے بعد تو اور بھی زیادہ آرام دہ معلوم ہونے لگا ہے۔ فرش پر قالین ہے۔ تولیے روز بدلے جاتے ہیں۔ مسز واٹسن سے اس روز سید صاحب نے نیا تولیہ مانگا تو بولیں۔ ''ڈیڑھ پونڈ روز میں تو نیا تولیہ ملنے سے رہا، ہمارے اس کمرے میں چار روشنیاں ہیں اور ہم چاروں رات بھر جلائے رکھتے ہیں کیونکہ لندن والے کمرے میں ہمیں اپنے پلے سے روشنی کرنی پڑتی تھی یعنی ہر دوسرے تیسرے دن میٹر کو رشوت دیتے تھے۔ اس کی جیب میں ایک شلنگ ڈالنا پڑتا تھا۔ ابھی اس روز ہم ایک خط لکھنے کو بیٹھے۔ ابھی خیریت موجود خیریت مطلوب تک پہنچے تھے اور غیب سے مضامین خیال میں آنے شروع ہوئے تھے کہ کھٹک سے بجلی بند۔ یہ شلنگ والی بجلی انسانی زندگی کی طرح ہے۔ اس کا کچھ اعتبار نہیں۔ ہم نے سوچا ماچس جلا کر اپنا کوٹ تلاش کریں کیونکہ معلوم نہیں کس کرسی، کس

www.pakistanipoint.com

صوفے یا پلنگ پر پڑا ہے۔ کھونٹی پر ٹانگنے کے ہم قائل نہیں۔ پھر اس میں سے شلنگ نکالیں لیکن روشنی ہوتی تو ماچس ہمیں ملتی۔ خدا جانے کہاں رکھی ہو۔ پہلے ماچس ڈھونڈنا اور اس کوشش میں دھڑا دھڑ چیزیں گرانا۔ اس کا سوراخ ڈھونڈنا بڑا طول عمل تھا۔ ہم نے خط اور مضامین غیب کے لیے اگلے روز کی تاریخ ڈال دی اور بستر پر دراز ہو گئے۔ رات کو جانے کس وقت سید سبط حسن آئے ہوں گے۔ ماچس جلائی ہو گی۔ میٹر کا منہ شلنگ سے بند کیا ہو گا اور روشنی پائی ہو گی۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔

www.pakistanipoint.com

ہم جرمن زبان پر بھی حاوی ہو گئے

جرمن کے متعلق سنا تھا کہ مشکل زبان ہے۔ جن کے لئے مشکل ہو گی، ہو گی، ہمیں تو اس کے سیکھنے میں چنداں دقت نہ پیش آئی۔ ممکن ہے اس کی وجہ ہماری طبعی ذہانت ہو۔ ہم یہ دعوےٰ نہیں کرتے کہ ہم گوئٹے اور شلر کی زبان کی باریکیوں پر تنقید کر سکتے ہیں یا جرمن زبان کی صرف ونحو پر کتاب لکھ سکتے ہیں، اتنا ضرور ہے کہ ہوٹل میں جا کر بے تکلفی سے کھانا مانگ سکتے ہیں اور راستہ بھی پوچھ سکتے ہیں۔ ہوا یہ کہ ایک بڑی نادر روزگار کتاب ہمارے ہاتھ آ گئی جس میں کھانوں کے انگریزی نام اور ان کے جرمن مترادفات لکھے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہم کمرے کی کنڈی لگا کر خشک بسکٹ نگلنے اور پانی پینے سے بچ گئے۔ اس میں لکھا تھا کہ راستہ پوچھنا تو پہلے کہو wo ist جس کا مطلب ہے ''کہاں ہے؟'' اس کے بعد مقام مطلوبہ کا نام لو۔ ازراہِ اخلاق Bitte (پلیز) بھی کہو۔ وہ جواب میں کہے گا۔ ناخ ریشتس (NACH RECHTS) یعنی دہنی طرف یا ناخ لینکس NACH LINKS یعنی بائیں ہاتھ یا یہ کہ سیدھے چلے جاو، گیرادے اوس GERADEAUS اس کے بعد تم دانکے شرن (شکریہ) کہو اور اپنی راہ لو۔ اب یہ تمام فقرات ہمارے وردِ زبان ہیں عام طور پر ہمارا مطلوبہ مقام دہنے ہاتھ بائیں کو یا سیدھا آگے ہوتا ہے، البتہ اگر کہیں ہم اسے پیچھے چھوڑ آئے ہوں اور ایک سے زیادہ موڑ مڑنے کی بات ہو یا ہمارا دیا ہوا پتہ شہر کے دوسرے حصے میں یا کسی دوسرے شہر میں ہو تو تھوڑی دِقت ہوتی ہے۔ مخاطب جرمن میں ایک تقریر کرنا ہے ہم یا..... (ہاں۔ ہاں) کہنے کے بعد سر ہلا کر دانکے شرن کہتے ہیں اور آگے بڑھ

www.pakistanipoint.com

www.pakistanipoint.com

جاتے ہیں کہ کوئی تو ملے گا جو ہماری جرمن زبان کی معلومات کے اندر رہ کر ہمیں بتائے گا، تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی۔

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

الانسان مرکب من الخطا والنسیان بے شک زبان پر ہمیں اس حد تک عبور حاصل ہو گیا ہے تاہم احتیاطاً ہم یہ فقرے اور الفاظ ایک پرچی پر لکھ مع اردو حروف میں ان کے تلفظ کے، اپنی جیب میں رکھتے ہیں اور یہ پرچی۔ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔ کتاب کا لکھنے والا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سخت اُبلے ہوئے انڈے کھانے کا شوقین تھا۔ ہم ہاف بوائلڈ کھاتے ہیں یا ہاف فرائیڈ۔ اس نے اس باریکی کا ذکر ہی نہیں کیا۔ لہٰذا ہمیں بھی سخت ابلا ہوا انڈا کھانا پڑتا ہے یا پھر کل یہ ہوا کہ ہم نے بھنی مرغی کا آرڈر دیا تھوڑی دیر میں بیرا یعنی بیری ایک بڑا سا قدحہ اٹھا لائی معلوم ہوا ہے کہ ہم رواداری میں بھنا مرغ BRAF HUHN کی بجائے HUHNER BRUHE (مرغی کا سوپ) کہہ گئے۔ زیدہ علیم وسیع ہونے کا یہی تو نقصان ہے ہم نے صرف ایک ہی لفظ یاد کیا ہوتا تو یہ قباحت کیوں ہوتی، ہم چاہیں تو جرمن زبان میں منشی فاضل کی ڈگری لا سکتے ہیں لیکن کیا فائدہ بلکہ دانستہ احتیاط کر رہے ہیں کیونکہ ابھی ہمیں پولینڈ وغیرہ جانا ہے۔ ان لوگوں کی جرمنی سے لڑائی رہی ہے کسی نے ہمیں جرمنی سمجھ لیا تو اچھا نہ ہوگا۔ یہ بھی کچھ سیکھا ہے اسے ہم جرمنی کی سرحد پر بھلا کر آگے جائیں گے جیسے اپنی فرنچ زبان ہم فرانس کی رسحد کے ادھر چھوڑ آئے ہیں۔ یوں بھی اتنا سامان کون اٹھائے اٹھائے پھرے۔

بون اور کولون میں گرجا اسی طرح ایک پر ایک چڑھے ہوئے ہیں جس طرح استنبول میں مسجدیں اور شان میں بھی یہ استنبول کی مسجدوں پر چشمک زنی کرتے ہیں۔ کولون کے گرجا کو دیکھئے۔ اس کی رفعت عظمت اور ہیبت آپ عمر بھر نہیں بھلا سکتے۔ فرینکفرٹ سے آتے ہوئے ہم نے افق پر گرجاؤں کے نکیلے کلس بھی دیکھے ایک تو ان میں قلعہ کوہ پر بھی ہے

www.pakistanipoint.com

خود ہمارے ہوٹل کے نواح میں پانچھ چھ پڑانے کلیسا ہیں۔ شام کو ان کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ کیا دلاویز سریلی تانیں اڑا رہی تھیں۔ دل والوں کو برگ درختاں سبز ہی معرفت کردگار کے لئے کافی ہیں۔ یہ گھنٹیاں تو پھر صدا رکھتی ہیں۔

ایک تو تنہائی کا عذاب جس کے باعث بعض اوقات گھنٹوں بستر پر پڑے یورپ کا نقشہ دیکھا کرتے ہیں، پھر سیر کرانے والے دوکان اپنی بڑھا گئے۔ ہم نے پوچھا ٹورسٹ آفس سے کہ ہے کوئی جو ہمیں شہر دکھائے، دریائے رائن کی میر کرائے اور اپنے ملک کے لیے ہم سے فارن ایکس چینج کمائے۔ لیکن جواب ملا ''نائیں'' یعنی نہیں۔ 30 ستمبر کے بعد جاڑا فرض کرلیا جاتا ہے اور یہ تمام تفریحی کاروبار ٹھپ۔ سیاح کو چاہیے کہ کمرے میں بیٹھ کر انگیٹھی تاپے۔ آخر ہم نے خود ہی رائن کی راہ لی، معلوم ہوا کہ وہ تو بالکل ہمارے ہوٹل کے پچھواڑے واقع ہے، یہ سیر ہماری بون میں آمد کا حاصل کہیے، کیا خوبصورت سیرگاہ ہے، یا پھر ہم نے برسوں پہلے ہالینڈ اور بلجیئم کی سرحد کنوک کے ساحل پر ایسا پایا تھا۔ کشتیاں بھی آجا رہی تھیں، لیکن ان پر جن منزلوں کے نام لکھے تھے وہ ہمارے نقشے میں نہ نکلیں۔ ممکن ہے چھوٹی بستیاں ہوں اور کیا عجب سو دو سو میل دور ہوں لہٰذا ہم نے خطرہ مول نہ لیا۔ بینچ پر بیٹھ کر لوگوں کی طفلانہ شوخیوں کو دیکھتے رہے۔ یہاں ہپی وغیرہ تو نہیں ہیں لیکن جوڑوں کا عالم یہاں بھی یہی ہے کہ:

چھاتی سے لگا چوم لیا ہو گئے چپکے

پھر اٹھ کر کینیڈی پل کے ادھر سے دوبارہ شہر میں داخل ہوئے

اِدھر ہی کہیں بیتھوون کا گھر تھا۔ جی میں آئی کہ اسے بھی دیکھ چلیں۔ بیتھوون کا نام ہمارے جن قارئین نے نہ سنا ہو ان کو معلوم ہو کہ یہ جرمنی کا نامور میراثی تھا۔ گانوں کی دھنیں بنایا کرتا تھا۔ ہم نے بھی ایک آدھ بار جب ریڈیو بند کرنا بھول گئے ہیں اس کی سمفنی سنی ہے۔ کیا بات ہے اس کی۔ لاجواب آدمی تھا۔ ہم سے تو ایسی دھن کبھی نہ بنے۔ ہم اپنی طرف سے تو ٹھیک چلے لیکن راستوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔ ایک جگہ ایک مرد

www.pakistanipoint.com

بزرگ لانبی سفید داڑھی چہرے پر، دانش کی تحریر، پیشانی پر بھویں آنکھوں پر سایہ کئے ایک گلی کے موڑ پر کھڑے مل گئے۔ ہم نے تو جرمن میں پتہ پوچھا۔ جب جرمن آتی ہے تو کیوں نہ بولیں۔ لیکن ان بزرگ نے انگریزی میں کہا بیتھوون کا گھر پوچھ رہے ہو صاحبزادے؟ وہ سامنے پھاٹک ہے اس کے اندر چلے جاؤ ہم نے کہا۔ ''ہماری کتاب میں تو کوئی اور سڑک لکھی ہے۔ یہ تو قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ اس پر دقیانوس نے فرمایا۔ ''بیٹا جی! بیتھوون صاحب اب تمہیں اس سڑک پر اس گھر میں نہ ملیں گے۔ وہ تو بہت دن ہوئے مر گئے۔ پھاٹک کے اندر چلے جاؤ دہنے ہاتھ دیوار کے ساتھ دس نمبر کی قبر ہے۔

اور یوں اس مرد دانا نے ہمیں بون کے ''قبرستان'' آلٹر فریڈ ہوف میں پہنچا دیا اور ہم نے بیتھوون کی ابدی آرام گاہ دیکھ لی اور وہاں سکوں کا وہ نغمہ سنا جو قبرستان کی چار دیواری کے باہر نہیں جاتا۔ یہ قبرستان اہلِ کمال کا گنج شایگاں ہے جگہ جگہ مٹی کے ڈھیر اور ان پر فلاسفروں، سائنسدانوں، شہرہ آفاق طبیبوں، پروفیسروں کے ناموں کی تختیاں۔ ہر قبر پر سدا بہار پودے ہیں۔ کہیں کہیں چراغ نما لالٹین بھی، کیونکہ جھٹ پٹا ہو رہا تھا۔ قبریں زیادہ تر پچھلی صدی کی۔ کچھ اس صدی کے شروع میں مرنے والوں کی بھی۔ بعض دوسری جنگ سے چند سال پہلے کی بعض قبروں کے سرہانے مجسمے بھی تھے۔ عام طور پر ایک خاندان کی قبریں سب یکجا۔ اس وقت تک سب لوگ آ کر جا چکے تھے، ان درختوں کے سائے اور دم بدم اترتے ہوئے اندھیرے میں یہ دور دیس کا راہی تنہا تھا۔ کبھی گرے کا مرثیہ یاد آتا تھا۔ کبھی کل من علیہا فان کا حکم۔ بڑے بڑے خطیب خاموش تھے۔ مسیحا نفس محو خواب عدم تھے مشرق و مغرب کی فتح کا خواب دیکھنے والے، پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنے والے، صحرا صحرا گھومنے والے، صاحبان انکشاف و ایجاد، رہ لوراں سیماب پا۔ اب اپنی اپنی دو گز زمین کے احاطے میں مست و مطمئن لیٹے آرام کر رہے تھے۔

چھیڑو نہ میٹھی نیند میں اے منکر و نکیر
سونے دو بھائی میں تھکا ماندہ ہوں راہ کا

کھانا ہمارا سیب

یہاں باڈ گوڈ سبرگ میں ایک عظیم الشان ادارہ ہے جس کا کام کلچرل ایکس چینج کا انصرام وغیرہ ہے۔ اس کا جرمن نام ہم لکھیں تو ایک تو یہ قباحت ہے کہ ہجے کی غلطی کر بیٹھیں گے۔ دوسرے وہ ایک آدھ سطر میں نہیں آئے گا۔ اٹھارہ اٹھارہ حرفوں کے الفاظ تو جرمن زبان میں عام ہیں لیکن اب یہ بھید کھلا کہ گھبرانے کی بات نہیں۔ محمد حسن عسکری والے استاد صبر سہارنپوری کے کلام کی طرح یہاں حرفوں کو ملا کر لکھنے کا رواج ہے۔ کیلے کی گیلی جڑ کو یہاں کیلیگیلیجڑ لکھیں گے۔ آخر ہم بھی تو آج شب کو ملا کر لکھتے ہیں اور پڑھنے والے اسے ''آجشبکو'' پڑھتے ہیں۔ لکھنے میں جگہ بچتی ہے اور کاغذ کی مہنگائی تو عالمگیر ہے۔

ہم ہر چند کہ جرمن حکومت کے مہمان نہیں لیکن جس بین الاقوامی ادارے کے فرستادہ ہیں اس نے جرمنی کی حد تک ہماری دیکھ ریکھ اسی جرمن ادارے کے سپرد کر رکھی ہے۔ اور واقعی نومان صاحب نے جو ہمارے پروگرام کے ذمہ دار ہیں، حق میزبانی خوب ادا کیا اور مس مونیکا شمٹز تو مہربانیوں میں ان سے بھی بڑھ گئیں۔ بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو خوبے دیگری۔ قارئین کرام اپنے اسپِ تخیل کو بے لگام نہ ہونے دیں اور بانوانِ پاکستان رشک سے اپنی انگلیوں کو نہ چبا ڈالیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔

باڈ گوڈ سبرگ ہی میں ہمارا سفارت خانہ ہے۔ ارشد الزماں سے ملنے وہاں گئے تو سفیر صاحب کو بھی سلام کیا۔ خان عبدالرحمن خاں ہمارے بڑے کامیاب ڈپلومیٹوں میں سے ہیں لیکن طبیعت اور گفتگو میں بالکل سادہ۔ فرماتے ہیں، میاں میں تو دیہاتی آدمی ہوں مجھ کو

www.pakistanipoint.com

www.pakistanipoint.com

لکھنویت نہیں آتی اور جرمن لوگ مجھے اس لئے پسند ہیں کہ سیدھے سادھے پٹھان لوگ ہیں۔ باتوں کے طوطا مینا نہیں بناتے۔ کوئی بات انہیں خوش آتی ہے تو ٹھیک ورنہ صاف جواب۔ پاکستان کے سچے دوست ہیں۔ مدد دینے میں دوسروں سے آگے، خود اعتمادی کے مالک ہیں، کسی کے دباؤ میں نہیں آتے، پھر بہادر ہیں، ہمارے جرمنی میں ایک بھی نکما یا احدی آدمی نہ ملے گا نہ کسی کو کمزور یا مدقوق پاؤ گے۔

گذشتہ اتوار کو کولون میں ہمارا سیب کھانے کو جی چاہا تھا۔ پونے دو مارک کے تین آئے تھے۔ آج دوپہر ہم مارکیٹ کی طرف جا نکلے تو ریڑھی پر سیب دیکھ کر پھر جی للچایا اور انگریزی محاورہ بھی یاد آیا کہ سیب کھاؤ اور ڈاکٹر کو بھگاؤ۔ پاکستان میں تو خود ڈاکٹر سیب کھاتے ہیں اور فیس کا بتا کر ہمیں بھگاتے ہیں۔ ہم نے دکاندار سے کہا کہ یہ لو ایک مارک جتنے جی چاہے دیدو۔ اس نے ایک بڑا تھیلا اٹھایا اور اس میں پندرہ بیس بھر دیئے۔ ہم نے کہا اے بھلے مانس فقط ایک مارک کے دے۔ ہم خوردہ فروش دکاندار نہیں ہیں کہ ان سیبوں کی ریڑھی لگائیں۔ فقط ذاتی استعمال کے لیے چاہتے ہیں۔ اس نے کہا جناب یہ ایک ہی مارک کے ہیں۔ وہاں سے جانا تو ہمیں کسی اور طرف کو تھا لیکن اس بوجھ کی وجہ سے سیدھے ہوٹل آئے۔

سیب کو بالعموم دانتوں سے یونہی کچر کچر کھا لیا جاتا ہے۔ آخر سبھی حیوان ایسے کھاتے ہیں تو انسان میں کونسا سرخاب کا پر لگا ہے لیکن اس وقت طبیعت ذرا مائل بہ نفاست تھی۔ ہم نے ہوٹل کی داروغن صاحبہ سے چاقو چھری وغیرہ کی فرمائش کی تا کہ کاٹ کاٹ کر کھائیں۔ اتفاق سے وہ ڈکشنری جو جرمن زبان میں ہمارے علم و فضل کی ذمہ دار ہے، ہم اوپر کمرے میں چھوڑ آئے اور چھری کی جرمن ہمیں زبانی نہیں آتی۔ داروغن صاحبہ کو انگریزی میں دخل ضرور ہے لیکن بس ایسا ہی، جیسا ہمیں جرمن میں ہے۔ ہم نے کہا ''نائف چاہیے، ایپل کاٹنا ہے'' ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو ہم نے ایک ہاتھ میں خیالی سیب رکھ کر دوسرے میں خیالی چھری لی اور اسے کاٹا۔ بچاری کند ذہن پھر بھی نہ سمجھی۔ اب ہم نے بریک فاسٹ کا حوالہ

www.pakistanipoint.com

دیا اور اشاروں اشاروں میں توس پر چھری سے مکھن لگایا۔ یہ اشارہ بھی مکھن لگانے سے زیادہ نائی کے استرا تیز کرنے سے زیادہ قریب ہو گیا۔ لہٰذا ہم نے خیالی سیب کو پھر دو ٹکڑے کیا۔

یکا یک محترمہ نے چہک کر کہا۔ ''سیوب''؟

ہم نے بھی خوش ہو کر کہا ہاں ہاں ''سیب۔'' اتنی دیر سے یہی تو کہہ رہا ہوں کہ سیب کاٹنا ہے اب لاؤ چھری۔''

ایک روز ہم نے پائن ایپل مانگا تھا تو دوکاندار نے کہا ''اناس''؟ تب ہمیں معلوم ہوا کہ یہاں یہ پھل اناس ہی کہلاتا ہے۔ اب یہاں بھی ہم اتنی دیر سے ''ایپل'' کاٹنے کی بات کر رہے تھے۔ شروع ہی میں سیب کہہ دیتے تو یہ فوراً سمجھ جاتیں۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ کسی نے اردو اور جرمن زبان کے مشترک الفاظ پر اب تک کچھ نہیں لکھا۔ کسی کو توفیق ہی نہیں ہوئی۔ شاید اس لئے کہ کسی کو جرمن آتی ہی نہیں تھی ہم نے طے کیا کہ عدیم الفرصتی کے باوجود وطن واپس جا کر ہم اس موضوع پر محققانہ مقالہ لکھیں گے ایک تو یہ سیب ہی مشترک نکلا اور بھی بہت سے الفاظ ضرور مشترک ہوں گے۔

اتنے میں محترمہ برآمد ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں نہانے کے صابن کی ایک ٹکیہ تھی۔ بولیں ''یہ لو سیوب''۔

PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

آنا برلن اور ٹھہرنا کفرستان میں

برلن۔ برلن۔ برلن۔! اے صاحبو حفاظتی بند باندھ لو، برلن آیا جاتا ہے۔ کسی اور شہر کے سواد میں جی پر وہ ہیبت طاری نہیں ہوتی جو برلن پہنچنے پر ہوتی ہے بشرطیکہ آنے والا کھالوں کا تاجر اور محض ایکسپورٹر نہ ہو۔ یہ شہر ہے پرشیا کی سطوت و حیروت والے بادشاہوں کا۔ شاہِ فیریڈرک اعظم کا پرنس بسمارک کا، قیصر ولیم کا، ہٹلر کا، آگ اور دھوئیں کا، ملکوں کی قسمتوں، کروڑوں انسانوں کی تقدیروں کے اعلان یہاں سے ہوتے تھے۔ نوشتے یہاں سے جاری ہوتے تھے۔ یہ سڑکیں جن پر اب شگفتہ چہروں والے لوگ چل رہے ہیں اور میاں آزاد ہم بے غل وغش قدم مار رہے ہیں، یہاں گستاپو کا عمل تھا۔ نازیوں کے جشن پریڈیں کرتے گزرتے تھے۔ سوستیکا کا جھنڈا لہراتا تھا۔ مائیکروفونوں سے فیوہر رکی گھن گرج سنائی دیتی تھی۔ زنداں آزادی پسندوں سے بھرے تھے۔ نواحات بندی خانوں سے آباد تھے جہاں لاکھوں بے بس انسانوں کو گیس کی بھٹیوں میں جھونک دیا جاتا تھا۔ ان کی چربی سے صابن بنتا تھا۔ ان کی ہڈیوں سے کھاد بنتی تھی۔ اتحادیوں نے آکر ان بندی خانوں کو دیکھا تو فقط زندوں اور مردوں کے ڈھانچے پائے یا گودام در گودام انبار در انبار بچوں اور بڑوں کے جوتوں کے جوڑے، ان کے جوتا ریک راہوں میں مارے گئے۔ اور آج یہ بلدہ پھر شہر ہے خوشحال، خوش باش اور خوش نہاد لوگوں کا۔ انسان عظیم ہے خدایا! ہمارے میزبانوں کی فرستادہ ایک لڑکی ایئرپورٹ پر ہمارا انتظار کر رہی تھی، خوش آمدید۔ ہم نے کہا: ''اے بی بی کیا نام ہے تیرا''؟

بولیں: ''سُو''

''بہت چھوٹا نام ہے سُو'' ہم نے کہا: ''اے نیک بخت! ہم دنیائے سُو اور مردمان سُو اور علمائے سُو نہ جانے کس کس سے بچتے یہاں تک پہنچے ہیں تو ہمیں اپنا اصلی نام بتا۔'' تب بولی ''بندی کو فرانسسکا کہتے ہیں''۔ ہم نے کہا یہ ٹھیک ہے۔ فرمایا مجھے آپ کے ساتھ رہنا ہوگا۔ وضاحت بھی کر دی۔ صبح سے شام تک۔ ہم نے کہا اچھا تو ہمیں اپنا شہر بھی دکھاؤ گی تب اس نے جیب سے ایک لانبا کاغذ نکالا جو چھپا ہوا تھا۔ ''پروگرام برائے حضرت ابنِ انشا آف اسلامک ری پبلک آف پاکستان'' ہم نے کہا۔ ہم سے دفتر نہیں دیکھا جاتا، ہم اتنے لوگوں سے نہیں مل سکتے۔ اتنی لائبریریوں کو ملاحظہ نہیں فرما سکتے۔ سخن کو مختصر کرو۔ ہم سے بون ہی میں یومان صاحب نے کہہ دیا تھا کہ برلن جا کر کام کے جھمیلوں میں نہ پڑ جانا، کچھ شہر بھی دیکھنا۔ بولیں۔ اب تو پروگرام بن چکا۔ ان لوگوں کو اطلاعیں ہو چکیں۔ اب ان کو منسوخ کرنا ممکن نہیں۔ ہم نے کہا۔ ہم برنیڈن برگ گیٹ پر کب جائیں گے، دیوار کب دیکھیں گے، مولوی محبوب عالم کا ہوٹل کب تلاش کریں گے۔ پھر مشرقی برلن بھی ہمیں ضرور جانا ہے۔ ہم نے بون میں تمہارے دفتر سے کہہ دیا تھا لیکن وہ بچاری کیا کر سکتی تھی۔ بولی۔ شامیں آپ کی خالی ہیں۔ بیچ میں بھی کہیں کہیں ایک دو گھنٹے آپ کو مل جائیں گے۔ ان میں آپ چاہیں تو شاپنگ کر لیں۔ ہم نے کہا بی بی: شاپنگ کی بات ہم سے نہ کر کہ ہم تو خود اپنے کو بیچنے نکلے ہیں کوئی دل و جان کا اچھا خریدار ملے تو ہمیں بتانا۔

برلن کہنے کو چار حصے ہیں لیکن واقعتاً الگ فقط مشرقی حصہ ہے سوویٹ سیکٹر۔ دیوار کے پچھلے۔ باقی تینوں یعنی امریکی، برطانوی اور فرانسیسی سیکٹر باہم ملے ہوئے ہیں، انتظام سب کا اکٹھا ہے۔ کوئی چوکی پہرہ نہیں۔ آپ معلوم نہیں کر سکتے کہ ان تینوں میں سے آپ کس سیکٹر میں ہیں۔ سوویٹ سیکٹر یعنی مشرقی برلن۔ وہ البتہ!

مغربی برلن کی مرکزی شاہراہ کا نام ہے KURFURSTEN اسے اپنے حساب سے پڑھا تو آواز نکلی۔ ''کفرستان'' اسی پر ہمارے ہوٹل کا نام تھا۔

www.pakistanipoint.com

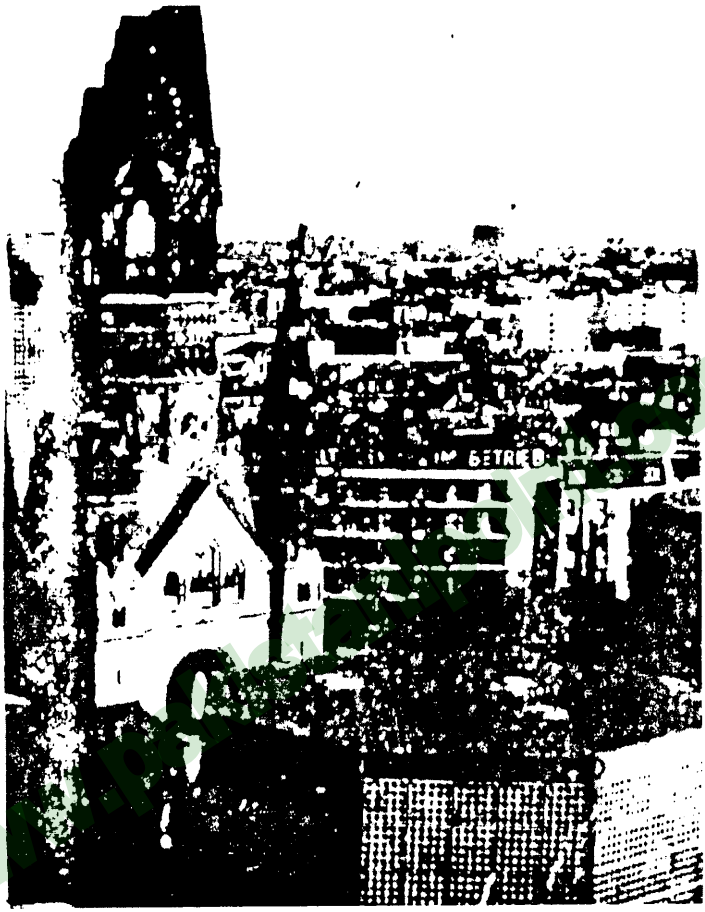

برلن.....ایک تباہ شدہ گرجا گھر کا پس منظر

''ہوٹل کفرستان''، یعنی کفر کا دم چھلہ یہاں بھی ہمارے ساتھ رہا۔

ع یاروں کو تجھ سے حالی کیا بدگمانیاں ہیں

ہم نے پہلے تو احتجاج کرنا چاہا کہ اسلامک ری پبلک کے آدمی کے لیے آپ نے اس نام کا ہوٹل کیوں مقرر کیا۔ پھر اس خیال سے چپ ہو گئے کہ اس ہوٹل میں اور اس شاہراہ پر

بتانِ کافر سے مڈبھیڑ ہوا کرے گی۔ کیا عجب کوئی موقع تبلیغ کا نکل آئے۔ اور کوئی ان میں سے راہِ راست پر آ کر ہمارے دستِ حق پرست پر بیعت بھی کر لے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ کسی کافر کو تو ہم اپنی راہ پر نہ لا سکے۔ ہاں ہمارا ایمان ضرور کئی بار متزلزل ہوا۔

ہوٹل ہمارا اچھا تھا۔ اتنے دنوں بعد ڈھنگ کا ہوٹل رہنے کو ملا۔ یورپ میں نجی باتھ روم والا ہوٹل ایک نعمت ہے جو پہلی بار نصیب ہوئی۔ ورنہ کسی نہ کسی حاجت (ضروریہ وغیر ضروریہ) کے لئے باہر جانا پڑتا ہے۔ چوغہ یا جھر جھالا یعنی ڈریسنگ گون ہم نے خاص اسی مطلب سے خریدا۔ فرینکفرٹ والا ہوٹل زیپلن بھی اچھا تھا لیکن اس کے مقابلے میں نمبر دو۔ بون کا ہوٹل بنز نسبتاً سستا معلوم ہوتا تھا لیکن منیجر صاحب نے بل بنایا تو اس میں تین مارک کسی چیز کے الگ لگے تھے۔ ہم نے کہا یہ کیا۔ بولیں آپ ایک روز نہائے جو تھے۔ غسل خانہ مشترک سہی لیکن آپ نے استعمال جو کیا ہے تو اس کے پیسے بھی دیجیے۔ ہم نے شکر کیا کہ چار دن میں فقط ایک بار نہائے۔ ورنہ ہم اپنے حلقے میں پانی کا جانور کہے جاتے ہیں۔ روز نہاتے ہیں۔ ہوٹل بنز میں بھی ہم سے یہ حرکت ضرور ہوتی، لیکن ہمیں غسل خانہ ملا ہی نہیں تھا۔ پوچھنا پڑا کہ آخر یہ چیز ہے کہاں؟ معلوم ہوا اوپر چھت پر ہے۔ بیت الخلا میں البتہ آپ بغیر پیسے دیئے مدار جا سکتے ہیں۔ بل میں تین مارک اور لگے تھے۔ ہم نے کہا اس کی وضاحت بھی ہو جائے۔ فرمایا آپ کے کمرے میں کمرہ گرم کرنے کی سلاخیں لگی ہیں نا؟ یہ تین مارک HEATING کے۔ ہم نے کہا وہ تو ہم نے استعمال ہی نہیں کیں بلکہ رات کو کھڑکی کھول لیتے تھے تاکہ تازہ ہوا آتی رہے۔ کمرے میں تو حبس تھا۔ بولیں: استعمال کرنے نہ کرنے کی سند نہیں ہے۔ پیسے تو دینے ہوں گے۔ ہم نے حساب جوڑا تو وہی پایا جو اچھے ہوٹل کا ہوتا ہے۔

صرف کفرستان ہی نہیں اور بھی کئی لفظ ہم نے اپنے حساب سے یاد کئے۔ ناشتے کے لئے جرمن میں بڑا ٹیڑھا لفظ ہے FRUSTUCK ناشتے کے کمرے پر لکھا نظر آیا۔

www.pakistanipoint.com

FRUSTUCKRAM ہم نے کہا وہ مارا یہ فرس تکارام کی خرابی ہے۔ سنت تکارام کا نام کس نے نہیں سنا۔ اگر چہ یہ کون تھے اور کیا کرتے تھے۔ قارئین کرام کی طرح ہمیں بھی معلوم نہیں۔ فرس کا مطلب گھوڑا۔ یعنی سنت تکارام کا گھوڑا۔ ظاہر ہے سنت صاحب کے زمانے میں گھوڑے ہی کی سواری ہوتی ہوگی۔ لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ جرمنوں نے ناشتے کے کمرے کے لئے یہ بے تکا نام کیوں رکھا۔ گھوڑے کو ناشتے کے کمرے سے کیا نسبت تا آنکہ یہ رعایت ملحوظ نہ ہو کہ دلی والے بھی نہاری کھاتے ہیں اور پنجاب میں تانگے کے گھوڑوں کو جو بھوسی چنے وغیرہ دیئے جاتے ہیں وہ بھی نہاری کہلاتے ہیں۔ ہماری تحقیق کا ٹٹو تو اس میدان میں یہیں تک جاتا ہے آگے اپنے فیل معنی کو محقق نکالیں۔

ہوائی سفر کے آرام پر سب کی نظر ہے لیکن اس کی قباحتوں اور صعوبتوں کو وہی جانتا ہے جو اس سے بار بار گزرے اور جسے اپنے اسباب کا وزن حد میں رکھنے کے لئے اسے بار بار کانٹے سے تولنا پڑے اور چیزوں کو پھینکنا پڑے۔ ہم تمام مسافروں کے مقابلہ میں دس کلو زیادہ لے جانے کا حق رکھتے ہیں کل تیس کلو یعنی چھیاسٹھ پونڈ۔ لیکن لندن سے چلے تو سترہ کلو زیادہ تھے۔ جس کے پیسے الگ دینے پڑے، یہ نہ سمجھا جائے کہ اس میں کوئی چیز غیر ضروری ہوتی ہے۔ ہم محتاط آدمی ہیں کچھ وزن تو ہمارے ساتھ چورن اور ہاضمے کی گولیوں کا ہے، اتنا لمبا سفر ہے اس لئے ہم نے خاصا ذخیرہ ساتھ رکھا ہے۔ ہیئر آئل کی بھی چند شیشیاں ہیں جانے کب ختم ہو جائے پردیس میں کہاں ڈھونڈتے پھریں گے کہ ہمیں روغن آملہ خاص الخاص یا باون جڑی بوٹیوں والا تیل چاہیے۔ کچھ پرانے رسالے نقوش اور فنون کے سالنامے اور بعضے ضخیم ناول اور تنقید کی کتابیں بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ تنہا آدمی کا جی گھبراتا ہے۔ مطالعے کے لئے ساتھ کچھ نہ کچھ رہنا ہی چاہیے۔ ایک سیٹ ہمارے ساتھ ہمارے دوست عبدالعزیز خالد کی کتابوں کا بھی ہے جن کی مدد سے ہم عربی سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ ہمیں قاہرہ وغیرہ جانا ہے اور جامع ازہر کے شیخ سے گفتگو کرنی ہے۔ کچھ پرانے

www.bookstanedir.com

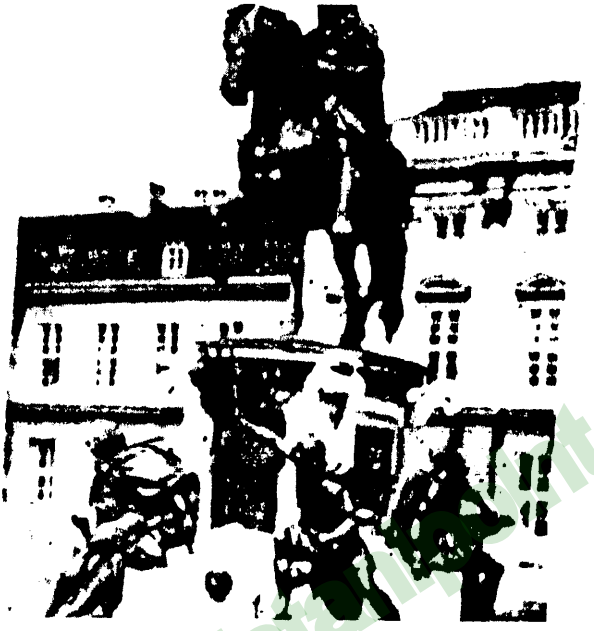

برلن کا ایک چوک

رسالے ہم نے لندن سے خریدے۔ پھر ہر شہر کے نقشے، گائیڈ بکس وغیرہ بھی ہیں۔ ہمارا جی تو انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا بھی ساتھ رکھنے کا تھا کیونکہ پردیس میں معلومات کی بڑی ضرورت رہتی ہے لیکن اسی سامان کے بوجھ کی قدغن کی وجہ سے نہ لا سکے۔ ہماری بوجھ اٹھانے کی صلاحیت بھی موجود ہے۔ کیونکہ منڈی میں اناج کی بوریاں ڈھونے کا کام ہم نے نہیں کیا۔ یورپ میں قلی نہیں ملتے اور سوٹ کیس، گٹھریاں، پوٹلیاں، بریف کیس، تھیلے، اتنا کچھ ہمارے ساتھ ہے کہ ہم گنتی تک بھول جاتے ہیں۔ یورپ والے کوئی چیز دیتے ہیں تو اس کا تھیلا اتنا خوبصورت ہوتا ہے کہ اسے پھینکنے کو جی نہیں چاہتا۔ پورٹر کہیں مل گیا تو اس کا منہ موتیوں سے بھرنا پڑتا ہے۔ ہمیں بس نے فرینکفرٹ کے ہوائی اڈے کے غلط دروازے پر اتار دیا تھا۔ پورٹر نے صحیح دروازے تک پہنچایا۔ ہم نے چار روپے دے کر یہ جانا کہ خوش گیا۔

لیکن اس بندۂ خدا نے تکرار کی کہ چھ روپے دو، اور لے کر ٹلا۔ اس پر اپنے قلی یاد آئے۔ تین ٹرنک سر پر ہیں، آپ کے بستر کیس کو جس میں دو رضائیاں، کمبل، جوتے اور کرائے سے بچنے کے لئے نہ جانے کیا کیا آپ نے باندھ رکھا ہے، اپنے کاندھے میں حمائل کرتا ہے اور پھلوں کی ٹوکری ایک ہاتھ میں، تھیلا اور صراحی دوسرے میں، ناشتہ دان کہنی سے لٹکا ہوا۔ بوجھ سے لہراتا ہوا چلتا ہے۔ پل پار کرتا ہے آنکھیں باہر نکلی پڑتی ہے اس کے بعد التجا کرتا ہے کہ اسے چار پیسے زیادہ مل جائیں۔ بعضے نیک دل دونی چونی دے دیتے ہیں۔ بعضے ڈانٹتے ہیں قانون کا حوالہ دیتے ہیں۔ ایک زمانے میں ایک آنہ فی تنگ فی پھیرا کرایہ تھا۔ اکنّی کی شکل بھی بنی رہتی تھی کہ کوئی زیادہ مانگے تو اسٹیشن ماسٹر کے پاس رپورٹ کی جائے۔ اب شاید دونی یا چونی کا ریٹ ہے۔ گاڑی چل دیتی ہے تو ہمارا یہ بھائی پاکستان کی روز افزوں ترقی اور اقبال مندی کا حصہ دار لال پگڑی سر کے نیچے رکھ پلیٹ فارم پر آرام کرنے کو لیٹ جاتا ہے اپنے روشن مستقبل کی ٹرین کے انتظار میں، جس کا سگنل نہیں گرتا، جو آنہیں پاتی۔

جب سے ہوائی سفر کا رواج ہوا ہے، لوگوں میں باہم محبتیں بھی کم ہو گئی ہیں۔ خلوص بھی رخصت ہوتا جا رہا ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ پر پیٹی باندھے اکڑا بیٹھا ہے۔ یہ نہیں کہ پاس والے سے کلام کرے۔ اس کی خیریت پوچھے۔ ذات پات وطن دریافت کرے۔ مسائل حاضرہ پر چندے گفتگو ہو۔ کچھ آل اولاد کے کوائف دریافت ہوں۔ کتنے بچے ہیں، کیا کرتے ہیں۔ کتنوں کی شادی ہو چکی۔ جہیز میں کیا آیا۔ کشمیر کب آزاد ہو گا۔ عرب کیسے جیت سکتے ہیں۔ سچا مسلمان بننے کی کیوں ضرورت ہے۔ نئی نسل میں بے راہ روی اور بے شرمی کیوں پھیل رہی ہے، وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہوائی سفر میں آزادی بھی محدود ہے۔ آپ بس اپنی سیٹ پر بیٹھ سکتے ہیں۔ چادر بچھا کر پوری برتھ پر پاؤں نہیں پسار سکتے۔ جیسے ہم تھرڈ اور انٹر میں کرتے ہیں۔ نہ ٹرنک اور بقچیاں پھیلا کر دوسرے مسافروں کا راستہ روک سکتے ہیں۔ پھر ریل میں آپ کے پاس آموں کی ٹوکری ہے، مزے سے آم کھائیے اور اس کی

www.pakistanipoint.com

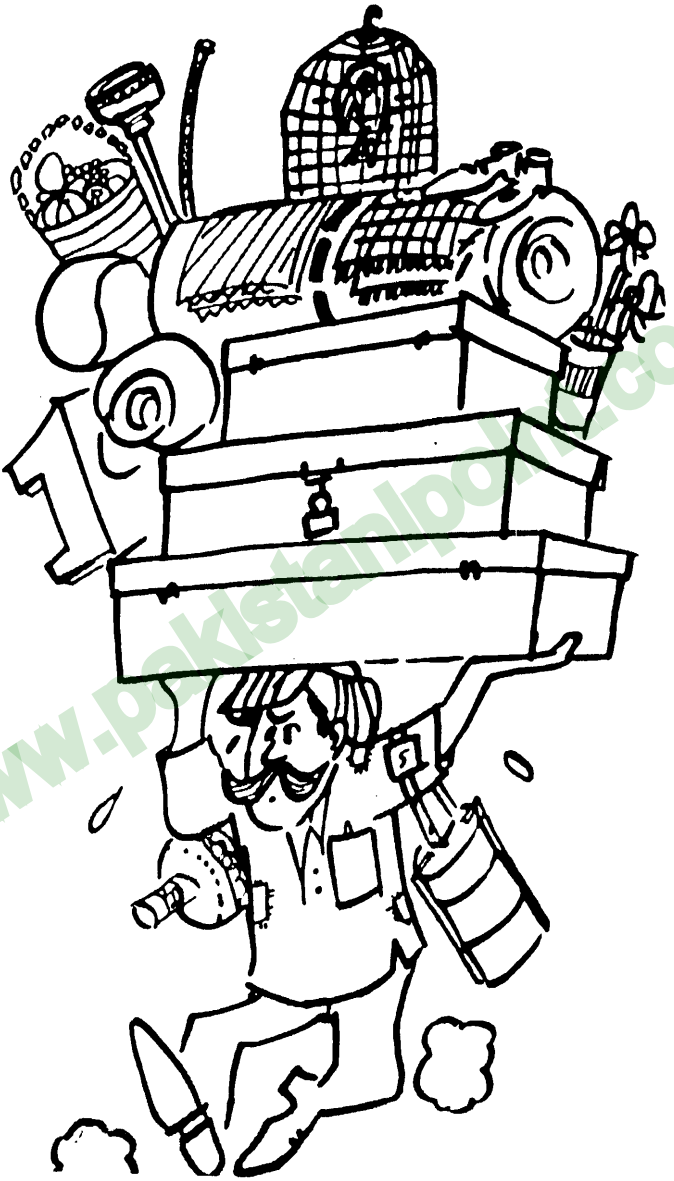

www.pakistanipoint.com

گھٹلیاں فرش پر پھینکئے۔ کسی کی کیا مجال جو ٹوک سکے۔ اگر لمبا سفر ہے اور برانچ لائن ہے۔ آپ کو ٹوبہ ٹیک سنگھ جانا ہے تو حقہ بھی سامنے رہنا چاہیے اور تمبا کو اور اُپلوں کا تھیلا بھی۔ اپنے نہیں تو گاڑی کے فرش پر کاغذوں سے آگ جلا لیجئے۔ دھوئیں کا کیا ہے۔ کسی صورت باہر نکل جائے گا۔ جہاز کے سفر میں تو چڑھتے اترتے وقت ''نو اسموکنگ'' کا حکم دیتا رہتا ہے اور اس بے آرامی کے کھڑاگ کا نام کیا رکھا ہے۔ 'ہوائی جہاز'

ہت تیری ہوائی جہاز بنانے والے کی۔

www.pakistanipoint.com

www.pakistanipoint.com

برلن۔ ہمارا اور منشی جی کا

ہم جن گائیڈ بکوں کی مدد سے بلاد یورپ کا سفر کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تو 1966ء کی چھپی ہوئی ہے جس کا نام ہے۔ ''یورپ میں پانچ ڈالر روز میں گزارا کیسے کیا جائے''۔ اس میں جگہ جگہ کے ہوٹلوں، سراؤں، ڈھابوں اور سستے ٹھکانوں کے پتے دیئے گئے ہیں۔ یہ سال بھر پرانی ہے۔ اس لئے بہت سی باتیں غلط ہوگئی ہیں بلکہ ہمارے تو یہ کسی کام نہ آئی۔ استنبول میں ہمارے دوستوں نے ڈیڑھ ڈالر روز کا ہوٹل تلاش کر کے مصنفِ کتاب کو زک دی اور ولایت میں کہیں ہمارا گزارا آٹھ دس ڈالر سے کم میں نہیں ہوا۔ دوسری گائیڈ بک کی بتائی ہوئی ہدایتیں بھی بہت دور از کار رہیں۔ اول تو اس کا مصنف، ہلٹن ہوٹل سے کم ہیں کہیں ٹھہرا نہیں۔ دوسرے اس کے سال طباعت 1955ء سے لے کر اب تک دنیا بدل گئی ہے۔ تیسری کتاب کے بتائے ہوئے اَتے پتے البتہ بہت جگہ صحیح نکلے۔ یہ اصل میں ایک سفرنامہ ہے۔ آج سے سڑسٹھ سال پہلے، 1900ء کے سفر کا تصنیفِ لطیف منشی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار۔ وزن اس ضخیم کتاب کا کوئی دو پونڈ کے قریب ہوگا۔ ہوائی سفر میں ہر بار جو ہمیں زائد اسباب کا جرمانہ دینا پڑتا ہے وہ بڑی حد تک اسی کتاب کے باعث ہے۔

برلن میں اس کتاب نے ہمیں بہت دوڑا ایا۔ ہم نے پوچھا فریڈرش سٹراس کہاں ہے تاکہ قیصر ہوٹل دیکھا جائے۔ جہاں مولوی صاحب ٹھہرے تھے۔ بتانے والوں نے بتایا

www.pakistanipoint.com

کہ یہ سڑک تو مشرقی برلن میں ہے اور بہت طویل ہے۔ پہلے اس ہوٹل کا مکان نمبر تو معلوم ہو۔ پھر چاہے ہوٹل رہا ہے یا نہیں رہا ہے، کم از کم وہ پرانی عمارت یا جائے وقوع تو دیکھ لو گے۔ لہٰذا پہلی جستجو پرانی ڈائریکٹریوں کی ہوئی یہ مغربی برلن کی اسٹیٹ لائبریری میں مل گئیں جہاں یہ لوگ ہمیں لاطینی زبان کے مخطوطے دکھانے لے گئے تھے۔ 1917ء کی ڈائریکٹری ہاتھ آئی۔ اس میں قیصر ہوف نامی ہوٹل کا پتہ درج تھا۔ کسی اور سڑک کا۔ ہم نے کہا۔ یہ نہ چاہیے۔ سب سے پرانی ڈائریکٹری اس ذخیرے میں 1870ء کی تھی۔ اس میں بھی دُرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔ آخر ہم نے کہا۔ بس اس سال کی دیکھنی چاہیے۔ 1900ء کی۔ خوش قسمتی سے مل گئی اور اس میں پتہ بھی صحیح تھا۔ مکان نمبر بھی دیا تھا 178 مالک کا نام اور ٹیلی فون نمبر بھی درج تھا۔ نمبر 637۔

دوسری چیز جس کی ہمیں تلاش تھی وہ برلن کے ایک پرانے اخبار ''برلنیر ٹاگ بلاٹ'' یعنی ''روزنامہ برلن'' کا ایک پرانا پرچہ تھا۔ منشی جی نے برلن پہنچتے ہی پانچ چار اخباروں کے ایڈیٹروں کو ملاقات کے لئے خط لکھ دیئے تھے۔ قریب قریب سب کے جواب دوسرے روز مل گئے۔ بلکہ ''برلنیر ٹاگ بلاٹ جو یہاں کا اول درجے کا آزاد اور انٹرنیشنل اخبار سمجھا جاتا ہے اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر لیوی سن نے میرے خط کا جواب بذریعہ ''اورہ پوسٹ'' یعنی دم کشی کی ڈاک سے اسی سہ پہر کو بھی بھیج دیا تھا۔ یہ طریقہ خط بھیجنے کا بھی برلن میں عجیب ہے۔ جس خط کو شہر کے دوسرے حصے میں بھیجنا مطلوب ہو، اس پر معمولی ڈاک سے دو چند محصول کا ٹکٹ چسپاں کیا جاتا ہے۔ یہ خط ایک نلکوں کے سلسلے کے اندر سے بذریعہ ہوا کے زور کے پہنچائے جاتے ہیں یعنی نلکے میں خط ڈال کر پیچھے مشین کی ہوا سے دھکا دیا اور دم زدن میں منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ جہاں سے تار کی طرح جلدی ہی تقسیم کر دیئے گئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ لندن میں بھی یہ طریق ڈاک جاری ہو گیا ہے اور پیرس میں بھی۔

www.pakistanipoint.com

غرض چٹھی پاتے ہی میں 7 جولائی کو 8 بجے شام کے مقررہ وقت پر ''برلیز ٹاگ بلاٹ'' کے دفتر میں پہنچا۔ ڈاکٹر لیوی سن اپنے کمرے سے باہر نکل کر مجھے اندر اپنے ساتھ لے گیا۔ ہندو مسلمانوں کی آبادی اور گورنمنٹ سے رعایا کے تعلقات پر گفتگو ہوئی۔ اور جب میں نے سمجھایا کہ کانگریس والے وہی خدمات سرانجام دینا چاہتے ہیں جو کسی زمانے میں فریق مقابل گورنمنٹ (اپوزیشن) ادا کرتا ہے تو اس کا ظن رفع ہوا کہ رعایا سرکار سے ناراض نہیں۔

میرے پاس پیسہ اخبار موجود تھا۔ جرمن ایڈیٹر اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس کی قیمت کی ارزانی اور مقدار اشاعت دونوں باتوں کو پسند کیا بلکہ مجھ سے وہ پرچہ لے لیا اور اپنے دوسرے روز کے اخبار میں میری ملاقات کی کیفیت معہ پیسہ اخبار کے ایک کالم کے فوٹو گراف کے چھاپ دی۔''

ہم محقق نہیں ہیں لیکن محققوں کے تلمیذ رشید تو رہے ہیں اور اگو کسی کالج یونیورسٹی میں آج کل نہیں، پرواں کے نکالے ہوئے تو ہیں۔ رجحان ہمارا اہلِ علم ہی کا سا ہے کہ ولی دکنی کے بیٹے کے ختنوں کی صحیح تاریخ معلوم ہونی چاہیے خواہ اس کے لئے کسی کو پی ایچ ڈی کیوں نہ بنانا پڑے۔ پس ہم اس مسئلے سے پلچ گئے کہ یہ پرچہ تلاش کرنا چاہیے اور اس کا فوٹو لے کر چھپوانا چاہیے تاکہ صاحبانِ تحقیق میں ہمارا نام لکھا جائے۔ سب سے پہلے تو ہم فرینکفرٹ یونیورسٹی میں گئے اور اس اخبار کا اَتا پتہ دریافت کیا۔ معلوم ہوا اس کا کوئی فائل فرینکفرٹ بھر میں نہیں ہے۔ پھر کولون اور بون میں جاتے ہی لائبریریوں کے پھیرے کیے۔ یہ متاع یہاں بھی نہ ملی۔ مغربی برلن پہنچتے ہی ہم نے میزبانوں سے کہا کہ ہاتھی نہیں چاہیے گھوڑا نہیں چاہیے۔ بس برلیز ٹاک بلاٹ کا یہ پرچہ چاہیے، اس کے لئے ہم نے منادی کرائی۔ گماشتوں کو مختلف علاقوں کے کتب خانوں میں دوڑایا لیکن خالی ہاتھ واپس آئے۔ ایک

www.pakistanipoint.com

لائبریری یہاں کی مایہ ناز گنی جاتی ہے۔ ایک اونچی عمارت ہے، لاکھوں کتابیں ہیں ہمیں اس کے کرتا دھرتا بڑے آور کے ساتھ لے گئے تھے کہ ہم دیکھ کے تعریف کریں گے۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے لیکن اگر جولائی 1900ء کا ''برلیز ٹاگ بلاٹ'' تمہارے پاس نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

تب ہم نے کہا اب ہم مشرقی برلن جاتے ہیں

یہ ظالم ہمارے مغربی جرمنی کے میزبان ہمیں لوگوں سے ملانے اور لائبریریاں دکھانے میں اتنا مصروف رکھتے تھے کہ مشرقی برلن جانے کا وقت ہی نہ ملتا تھا۔ آخر میں لائبریریوں سے ہم یہ کہہ کر بھاگے کہ ہماری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور سیدھے سٹاڈبان کے اسٹیشن پر پہنچے۔ سٹاڈبان اے سادہ لوح قارئین کرام کسی جگہ یا چڑیا کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ایک خاص ریل کی سواری ہے۔ اس کے ڈبوں میں بھی کوئی سرخاب کے پر نہیں لگے تو پھر یہ کیا ہے؟ ہمیں برلن جانے سے پہلے ہی منشی محبوب عالم کی زبانی معلوم ہو چکا تھا۔

''شہر کے اندرونی حصہ کے گرد اور عام طور پر شہر کے اندر ایک حلقہ ریل کا گزرتا ہے جس کی سڑک یک منزلہ مکانات کی چھتوں کے برابر یا بیس فٹ بلند ہے اور اس سڑک کے نیچے 66 پل شہر کے اندر ہیں جرمن اس کو سٹاڈبان یعنی شہر کی ریل کہتے ہیں۔ اس کے اسٹیشن دو دو میل کے فاصلے پر ہیں۔ گاڑی ہر پانچ منٹ کے بعد ہر اسٹیشن سے دونوں طرف روانہ ہوتی ہے اور نصف منٹ سے زیادہ کسی اسٹیشن پر نہیں ٹھہرتی۔ اس ریل کو پرنس بسمارک نے تجویز کیا تھا۔ ٹکٹ دینے کے لیے کوئی شخص نوکر نہیں البتہ چند مشینیں لیٹر بکسوں کی طرح کھڑی ہیں جب کوئی ان میں فینی کا سکہ ڈالتا ہے، جھٹ ایک ٹکٹ تیسرے درجے کا ان کے ایک منہ سے گر پڑتا ہے۔

سٹر سٹھ سال میں اگر اس معمول میں کوئی فرق ہوا تو یہ کہ اب ریل پانچ کی بجائے ہر

برلن میں کارگروں کے مجسمے

پندرہ منٹ بعد چھوٹنے لگی ہے اور ٹکٹ دینے کا سلسلہ آٹو میٹک نہیں رہا بلکہ آدمی کھڑکی میں بیٹھا پیسے لیتا ہے ٹکٹ دیتا ہے۔ آٹو میٹک سلسلہ ہم نے فقط مشرقی برلن کی بسوں میں دیکھا۔ اس فرق سے قطع نظر پل وہی راستے وہی ہیں، اسٹیشن وہی ہیں اور شاید کچھ گاڑیاں بھی وہی ہیں جن میں ہمارے منشی صاحب بیٹھتے رہے ہیں۔ ہم بھی بیٹھ کر اترے تو مشرقی برلن میں اسی اسٹیشن پر اترے۔ جہاں سے منشی صاحب چڑھتے اترتے ہوں گے۔ فریڈرش سٹراس کا اسٹیشن۔ سٹراس کا مطلب روڈ ہے۔ ہر سڑک کا نام اس پر تمام ہوتا ہے۔

مشرقی برلن کا کسٹم والا ہمارے تھیلے کے کاغذوں کتابوں کی پڑتال میں کچھ زیادہ ہی دیر لگا رہا تھا بلکہ ہمارا ایک آرٹیکل ایک جرمن رسالے میں چھپا ہے وہ بھی شومئ قسمت سے بستے میں تھا۔ اس کا بالاستیعاب مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ ہم نے کہا اے بھیا، چھوڑا سے، اپنے پاس رکھ لے اور ہمیں اسٹیٹ لائبریری کا پتہ بتا۔ اس پر وہ بھلا مانس چونکا اور کہا،

جات فریڈرش سٹراس سے انٹرڈن لینڈن بائیں ہاتھ مڑو۔ تھوڑی دور بعد بائیں ہاتھ کو اسٹیٹ لائبریری ہے۔ ''اسٹاٹ ببلیوتھک'' آٹھ بجے تک کھلی رہے گی۔''

ہم نے مشرقی برلن کے سیاسی اور اقتصادی حالات اور دوکانوں کا مطالعہ آئندہ پر چھوڑا اور لائبریری کا رُخ کیا۔ بڑی پرشکوہ عمارت ہے۔ چوڑے پاٹ کی سنگین اور بلند و بالا، جنگ میں ایک حصہ تباہ ہو گیا تھا لیکن زیادہ تر بچ رہی۔ کتنی ہی سیڑھیاں چڑھنے اور غلام گردشوں سے گزرنے کے بعد رسالوں اور اخباروں کا شعبہ آیا۔ بہت سے لوگ سر جھکائے پڑھ رہے تھے۔ فائل مختلف میزوں پر پڑے تھے۔ ایک بی بی لائبریرین سر جھکائے اپنا کام کر رہی تھیں۔ ہم نے عرضِ مطلب کیا کہ ہم برلیز ٹاگ بلاٹ کی تلاش میں آہنی پردے کے پیچھے آئے ہیں۔ ہمارا سوال پورا ہونا چاہیے۔

یہ محترمہ بہت کم انگریزی جانتی تھیں۔ اٹک اٹک کر بولتی تھیں۔ فرمایا: ''مل تو جائے گا لیکن کل جو صاحبہ انچارج ہیں وہ موجود نہیں، پانچ بجے چھٹی کر جاتی ہیں۔''

ہم نے کہا ''ہم عمر میں پہلی بار برلن آئے ہیں اور آج جا کر شاید نہ لوٹ سکیں کچھ کرو کامریڈ ہمارے لئے۔''

بچاری بہت اچھی تھیں۔ ہم نے بات میں زور پیدا کرنے کے لئے کہا ''ہمارے دادا یہاں آئے تھے۔ ان کا ذکر اور ان کے اخبار کا فوٹو اس میں چھپا ہے (ہمارے نہ سہی ہمارے دوست حبیب عالم کے دادا تو تھے) رشتے کے حوالے سے ان کی دلچسپی بڑھ گئی اور بچاری نے ایک لمبا فون کیا اور پھر خود اُٹھ کر گئیں۔ آدھے گھنٹے میں ایک فائل نکال کر لائیں اور جولائی 1900ء کا برلیز ٹاگ بلاٹ ہمارے سامنے تھا۔

ہمارے منشی جی 7 جولائی کو اس کے ایڈیٹر سے ملے تھے۔ اور ان کے بیان کے مطابق دوسرے دن کے پرچے میں پیسہ اخبار کا فوٹو چھپا تھا۔ ہم نے 8 جولائی کا پرچہ نکالا۔ اس

www.pakistanipoint.com

میں کچھ نہ پایا تو 9 جولائی میں جھانکا کہ شاید، پھر دس جولائی، گیارہ جولائی، بارہ جولائی، تیرہ جولائی، چودہ جولائی۔ آخر مایوس ہو کر فائل بند کر دیا محنت اکارت گئی۔ پیسہ اخبار کا عکس کہیں نظر نہ آیا۔ جی میں طرح طرح کے وسوسے آئے۔ منشی جی نے یونہی تو نہیں اڑا دی تھی۔ احتیاطاً ہم نے سات کا پرچہ بھی دیکھ ڈالا۔ آٹھ، نو، دس کا ایک ایک کالم بہ نظر غائر پھر دیکھا۔ یہ تراشہ ہمیں نہ ملنا تھا نہ ملا۔ آخر اس بی بی سے ہم نے کہا! ابھی اخبار لوٹایئے نہیں، کل ہمیں وقت ملا تو پھر آئیں گے۔''

دل میں عجب دبدھا سا تھا۔ سفرنامہ آ کر دوبارہ پڑھا۔ اس میں وہی دوسرے دن کا حوالہ تھا۔ تیرہ کو تو منشی جی برلن سے چلے ہی گئے تھے، انہیں دھوکہ ہوا کیا؟

اگلے روز دیکھنا تو ہمیں ہسٹری کا میوزیم بھی تھا کیونکہ پہلے روز لائبریری میں اتنا وقت لگا کہ میوزیم بند ہو رہا تھا لیکن قدم کشاں کشاں لائبریری ہی میں لے گئے۔ اب ہم نے سوچا کہ ٹھہر ٹھہر کر پورے مہینے کا پرچہ دیکھیں گے۔ چودہ کے بعد پندرہ جولائی کے شمارے کے آٹھ صفحے الٹے تھے کہ نویں صفحہ پر پیسہ اخبار اور اردو تحریر نظر آئی۔ ہم نے اطمینان کی ایک ٹھنڈی سانس لی۔ منشی صاحب کے متعلق جو ذرا سی بدگمانی ہوئی تھی اس پر افسوس بھی ہوا۔ یہ عکس ''پیسہ اخبار'' یوم شنبہ 14 اپریل 1900 کے ادارتی کالم کا تھا۔ سرخی تھی۔

''تعلیم اسلام حکومتِ انگریزی کی کیسی مؤید ہے''۔

سرخی کے نیچے ایڈیٹر کا نوٹ:۔

''حال ہی میں دو یوروپین افسروں کے ایک جاہل سرحدی آدمی کے ہاتھ سے بلاوجہ قتل کئے جانے پر جو رائے میں پیسہ اخبار میں ظاہر کر چکا ہوں کہ ایسی شقاوت اور سفاہت کی کارروائی کسی طرح بھی باعثِ ثواب نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی سچا مذہب اس کو روا رکھ سکتا ہے۔ اس کی تائید میں ایک ضروری سرحدی اسٹیشن کے تمام معزز طبقہ کے مسلمانوں لی

رائے مجھے دستیاب ہوئی ہے۔ میں ان کالموں میں اسے نمایاں جگہ دیتا ہوں‘‘.....

(ایڈیٹر)

اس کے نیچے کی تحریر کس کے قلم سے ہے معلوم نہیں ہو سکا۔ کیونکہ کالم کا اختتام ایک نامکمل فقرے پر ہوتا ہے۔

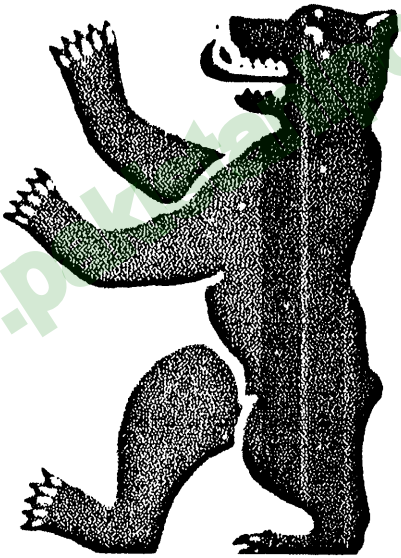

www.pakistanipoint.com

رائٹ برادران سے رجب علی سرور تک

یورپ والوں کی خوبیاں اپنی جگہ لیکن یہ لوگ ہیں کم سواد۔ ہوسکتا ہے ہم غلط لوگوں سے ملتے رہے ہوں۔ بہرحال ذاتی تجربہ یہی ہے کہ ہر چند ہم نے بات سے بات نکال کر جتایا کہ ہم شاعر ہیں۔ کسی نے خاص اعتنا نہ کی۔ ہمارا دیوان جیسا بستے میں ہم نے باندھا تھا ویسا بندھا ہے۔ ایک صاحب سے تعارف ہوا کہ یہ بھی مصنف ہیں۔ ہم نے اشتیاق سے پوچھا۔ کیا لکھتے ہیں آپ؟ شاعری؟ ناول؟ بولے جی نہیں۔ میرا مضمون الکٹرانکس ہے۔ ہم پوچھنے کو تھے کہ الکٹرانکس کیا ہوتی ہے؟ لیکن از راہِ مصلحت باز رہے۔ ایک ادارہ کتابیں تیار کر رہا ہے۔ جو پاکستان بھی آئیں گی، ہم بھاگے بھاگے وہاں گئے۔ معلوم ہوا دھاتوں پر کیمیاوی اثرات، ویلڈنگ، خراد اور آئل ٹیکنالوجی وغیرہ کی کتابیں ہیں۔ ہم نے بہت کرید کی کہ علم بدیع و معانی کی کوئی کتاب بھی شاید ہو۔ اور صنعتوں ہی پر زور ہے تو صنعت توشیح، مراعات النظیر، بے نقط وغیرہ کئی صنعتیں ہم نے ایم اے میں پڑھی تھیں، ان پر کچھ کام ہونا چاہیے۔ جیسا ہمارے ہاں ہو رہا ہے کہ ایک صاحب نے کتاب لکھی جس کی ہر سطر اور ہر لفظ سے تاریخ نکلتی ہے سن ہجری یا سال عیسوی برآمد ہوتا ہے لیکن سہیات۔ یورپ والوں نے صنعت کے لفظ کے معنی ہی بدل دیئے ہیں۔ کہاں تو یہ شریف اصطلاح زبان و بیان کی باریکیوں کے لیے استعمال ہوتی تھی، یا اب لوہے فولاد کیمیاوی کھاد تیل وغیرہ کے کارخانے صنعتیں کہلانے لگے ہیں۔

www.pakistanibooks.com

کچھ دنوں تو ہم لوگوں سے سائنس اور صنعت وحرفت وغیرہ کی باتیں سنتے رہے لیکن ایک دن ہم سے رہا نہ گیا۔ ہم نے کہا یہ کیا آپ لوگ سائنس اور ٹیکنالوجی وغیرہ کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے بھی اس خصوص میں بہت کام کیا ہے۔ میڈیکل سائنس میں ایسی دستگاہ تھی کہ ایک ہمارے حکیم نے ایک صاحب کی بدہضمی کی فوراً تشخیص کر دی کہ تم نے تربوز بہت کھایا ہے۔ محض عقل اور قیافے کے زور سے اور محض یہ دیکھ کر کہ مریض کے اردگرد تربوز کے چھلکے بکھرے تھے۔ اسٹرانومی یعنی علم ہیئت میں اب بیشک روس اور امریکہ وغیرہ کے حوصلے کھل گئے ہیں کیونکہ ہم میدان میں نہیں ہیں۔ ہماری توجہ دوسرے ضروری امور کی طرف ہے ورنہ ہمارے مدرسوں میں درس نظامیہ میں علم ہئیت بھی پڑھاتے تھے۔

ایک صاحب کو دلچسپی پیدا ہوئی، بولے یہ علم ہئیت کپلر اور کوپرنیکس وغیرہ والا۔ ہم نے استہزائیہ ہنسی ہنس کر کہا! یہ لوگ تو ابھی کل کی پیداوار ہیں۔ ہمارے حکما نے ان سے سدیوں پہلے ستاروں اور سیاروں وغیرہ کا سراغ لگا لیا تھا۔ بلکہ ستارے دیکھے ہی نہیں، یہ بھی تحقیق کیا کہ ان کا رفتار زمانہ پر اور لوگوں کی قسمتوں پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اس موضوع پر ہمارے ہاں اب بھی بے شمار تصانیف از قسم جنتریاں موجود ہیں بلکہ بعضے ادارے تو سال کے سال نئی جنتریاں چھاپتے ہیں۔ جس میں برج، حمل، برج عقرب وغیرہ کے سعد ونحس کے ساتھ ساتھ خوابوں کی تعبیریں، فالنامے وغیرہ درج رہتے ہیں۔ جا بجا زائچے بھی دیئے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ان میں صابن سازی، بوٹ پالش بنانے اور پونڈ کریم اور قدرتی رنگ کا خضاب وغیرہ تیار کرنے کے نسخے بھی دیئے ہوتے ہیں جس سے اس گمان کی ایک حد تک تردید ہو جانی چاہئے کہ ہماری توجہ صنعتوں کی طرف نہیں ہے اور ہم محض خیالی باتیں کرتے ہیں۔

www.bookstanpoint.com

ہمارے ہاں سے پرانی وضع کے لوگ یورپ جاتے رہے ہیں۔ بس جاتے تھے اور پھر پھرا کے خالی ہاتھ آ جاتے تھے۔ ٹرانزسٹر، ریفریجریٹر، ٹیپ ریکارڈ وغیرہ کچھ ساتھ نہ لاتے تھے۔

اس کی توجیہہ تو کوئی کرنا چاہے تو یہ بھی کر سکتا ہے کہ اس زمانے میں یہ چیزیں نہیں ہوتی تھیں، کیونکہ اور کچھ ہم جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں تاویل کرنا خوب جانتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ بس کتابیں اور سفرنامے وغیرہ لکھتے تھے۔ سرسید احمد خاں گئے۔ کچھ تو اسلام کا مقدمہ لڑتے رہے۔ میور کی کتاب کے جواب فراہم کرتے رہے۔ اور واپس آئے تو سائنٹیفک مسلمانوں کے متعلق انگریزوں کی بدگمانیاں دور کرتے رہے۔ وہ تو اس زمانے کے مولوی ذرا مستعد تھے ان کی نیچریت اور کفر وغیرہ کو فوراً پکڑ لیا ورنہ سید صاحب جانے کہاں تک جاتے۔ شیخ عبدالقادر گئے تو اقبال کو خط لکھ مارا کہ:

کام جو کر رہی ہیں قومیں اُنہیں مذاق سخن نہیں ہے

اور مخزن میں ایک مضمون بھی لمبا چوڑا لکھا کہ ''گھر سے نکل کے دیکھو۔ ہندوستان والو۔'' ہر پھر کے پھر ذکر مولوی محبوب عالم کا آتا ہے کہ اچھے خاصے پرانی وضع کے آدمی تھے۔ داڑھی تو بیشک یوروپ جا کر نہ منڈوائی اور گوشت کھانے میں بھی احتیاط کرتے رہے۔ فقط یہودیوں کی دکانوں سے قوشر یعنی حلال کھانے یا سبزیاں دالیں کھاتے رہے اور ہماری طرح ٹھنڈا پانی پیتے رہے لیکن ویسے مغرب کی ترقی سے ان کی آنکھیں چوندھیا گئیں۔ اپنے 1900ء کے سفرنامے میں برلن کے ٹیکنیکل ہائی سکول کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے بھی جا کر یہ سکول دیکھا اگرچہ اب یہ یونیورسٹی بن گیا ہے لیکن عمارت وہی پرانی ہے جو مولوی محبوب عالم نے دیکھی تھی۔ ذرا ان کا بیان سنیے کیسے لٹو ہوئے ان لوگوں پر کہ ہمارے کلاسیکل طرز تعلیم تک کی برائی کر دی۔

www.pakistanipoint.com

''جس چیز نے جرمنی کو بڑی شہرت اور عزت دی ہے وہ یہاں کا پالی ٹکنی گم یعنی ٹیکنیکل ہائی سکول ہے۔ یہ مدرسہ ایک سو ایک سال سے جاری ہے۔ میں ساڑھے پانچ گھنٹے برابر اس عالی شان تعلیم گاہ کی مختلف منزلوں اور درجوں کا طواف کرتا رہا۔ آدھا بھی نہ دیکھ سکا۔ آرگینک اور ان آرگینک کمسٹری کے تجربے دیکھے۔ آج کل یورپ کے تین ہزار طالب علم یہاں تعلیم پاتے ہیں۔ سوائے ترکی کے یورپ کے ہر ملک کے طالب علم یہاں ہیں۔ ایک عجائب خانہ میں ہر قسم کی مشین کا چھوٹا سا نمونہ طالب علموں کے سمجھانے کے لیے رکھا ہے لیکن ایک دوسری جگہ ایک مکان میں مشینوں کے ہر پرزہ کے مختلف عمل اس کے مختلف حصوں سے دکھائے گئے ہیں۔ عمارات اور پلوں کے ماڈل، دخانی جہازوں کے نمونہ نقشہ کشی، بخاری، علم رنگ کے لکچر کے کمرے اور خدا جانے اور کتنے کمرے اور لکچر روم۔ جرمنوں کا یہ کہنا ذرا بھی بے جا نہیں کہ اتنا بڑا مدرسہ اس فن کا دنیا میں کوئی دوسرا نہیں۔ مسلمان بڑے ناز سے اب تک یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی میں ایک وقت میں دس ہزار طالب علم پڑھتے ہیں اور مراکو کے فیض کے دارالعلوم میں بھی کئی ہزار طالب علم پڑھتے ہیں۔ مگر بھلے آدمیو دیکھو تو سہی وہ کیا پڑھتے ہیں اور یہ کیا پڑھتے ہیں۔ جن علوم کو الازہر اور فیض میں پڑھایا جاتا ہے وہ اب بوسیدہ ہڈیاں ہو چکی ہیں۔ کوئی مینبدی پڑھنے والے کو ذرا امریکہ کی مشہور بک یونیورسٹی کی رصدگاہ میں یا گرینچ (انگلستان) کی رصدگاہ میں لے جا کر مقابلہ تو کرے کہ وہ فرضی علم ہیئت صحیح ہے یا یہ عینی مشاہدہ ستاروں کا عظیم الشان دوربینوں سے۔ جو لوگ اس قسم کے مقابلوں کو پسند نہیں کرتے وہ مجھے معاف کریں۔

تو و طوبیٰ و ماو قامتِ یار
فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست''

www.pakistanipoint.com

آگے چل کر مولوی محبوب عالم دردمندی سے لکھتے ہیں:۔

''اس ٹیکنیکل سکول کے معائنہ کے دوران میں اس کی عظمت اور سامان کو دیکھ کر مجھے اپنا آپ نہایت حقیر معلوم ہوتا تھا اور مایوسی ہمت کو ایسا پست کر رہی تھی کہ دل میں خیال گزرتا تھا کہ اس قسم کی زندگی کا تو خودکشی سے خاتمہ کر دینا چاہیے جو ایسی ناکارہ ہے۔ یہ ایک ایسے سلسلہ خیالات کا نتیجہ تھا کہ جس کے یہاں درج کرنے کی ضرورت نہیں لیکن یہ تو روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی ایسی تعلیم گاہ ابھی دو صدیوں تک قائم نہیں ہوگی۔''

سچ پوچھیے تو آج کل ہمارا ایمان بھی ڈانواڈول ہو رہا ہے کچھ دن پہلے تک ہمارا خیال تھا کہ ہمیں سچے مسلمان بننا چاہیے۔ اور کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب ہمارا خیال ہے کہ سچے مسلمان بننے کے علاوہ بھی بہت کچھ کرنا پڑے گا۔ قوم کو صنعتی تعلیم دینی ہوگی کارخانے بنانے ہوں گے۔ اجتماعی فارموں میں ٹریکٹروں اور مشینوں سے کاشت کر کے پیداوار بڑھانی پڑے گی تاکہ ملک کی معیشت مستحکم ہو۔ سب اچھا کھائیں، پئیں، ٹیلی ویژن جناب شیخ ہی کے گھر میں کیوں ہو۔ مرید سادہ کے گھر میں کیوں نہ ہو۔ یہ لوگ جو آج پڑھ لکھ کر کلرک اور چپراسی کی نوکری کے لئے مارے مارے پھرتے ہیں۔ کل مکینک اور خرادیئے ہوں گے تو اپنی خودی کو بھی بلند کر سکیں گے۔ میرے آپ کے محتاج نہیں ہوں۔ گے جب آپ کے کھیت آباد کارخانے رواں، خزانے بھرپور اور لوگ خوش باش ہوں گے پھر کیا مجال ہے جو کوئی ہمسایہ یا غیر ہمسایہ ٹیڑھی نظر سے آپ کو دیکھ سکے۔ اس وقت سچے مسلمان بننے کا مزہ بھی زیادہ ہوگا۔ اس وقت تو

شب جو عقدِ نماز بر بندم
چہ خورد بامداد فرزندم

www.pakistanipoint.com

صاحبو! اوروں کی کیا کہیں۔ ہم نے بھی ساری عمر شاعری ہی کی۔ دوسروں کی شاعری پر واہ واہ اور مکرر ارشاد میں عمر گزار دی۔ کیا کریں ہماری تعلیم ہی سوداؔ اور میرؔ کے کلام سے شروع ہوئی۔ چھٹی جماعت کے اردو کورس میں میرؔ تھے۔ خواجہ میر دردؔ تھے، آتشؔ تھے، سوز و گداز تھا۔ وہ تو خدا بھلا کرے کہ ماسٹر گوروبال سنگھ تھوڑی سائنس بھی پڑھا دیتے تھے جس سے کچھ تصور ایصال حرارت اور قوت انابیب شعری اور حیاتین وغیرہ کا اب تک ہے اور یہ معلوم ہے کہ فارن ہائیٹ کیا ہوتا ہے۔ مکتب میں پڑھے ہوتے تو..... جھوم جھوم کر پڑھنا شام کو روٹیاں مانگ کر لانا۔ چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر لڑنا۔ مین میکھ نکالنا اور اس بات سے غافل رہنا کہ دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی ہے۔ فضا میں کیا ہو رہا ہے، خلا میں کیا ہو رہا ہے۔ علم الکلام کے رموز تو استاد نے پڑھا دیئے۔ جابر بن حیان کا نام نہ بتایا۔

جب کپلر اور گلیلیو آسمان میں تھگلی لگا رہے تھے۔۔۔ ہم شاعری کر رہے تھے۔

جب واٹ اور اسٹیفن بھاپ کو غلام بنا رہے تھے۔ شاہ نصیر دہلوی کی کوشش تھی کہ کوئی قافیہ بندھنے سے نہ رہ جائے۔

جب ایڈیسن اور مارکونی برق اور آواز کے دیووں کو اسیر کر رہے تھے۔ ہم شعری گلدستے فتنہ اور عطر فتنہ نکال رہے تھے۔

جب رائٹ برادران کلوں سے ہوا میں اڑ رہے تھے۔ ہم اور رجب علی بیگ سرور لفظوں کے طوطے مینا بنا رہے تھے۔ ہر مصرع سے تاریخ نکال رہے تھے۔

اور جب امریکہ اور روس نے آسمان کے لئے نئے چاند ستارے بنا لیے ہم پرانے اختر شناس اب بھی جنتریوں اور فالناموں میں اپنی قسمت کا حال دیکھ رہے ہیں۔ اب بھی ہمارے ہوٹلوں کے بالا خانے عطائی معالجوں، ہرڑ پوپوں سے آباد ہیں۔ عباسیوں کے

www.pakistanipoint.com

عہد کو کتنی صدیاں ہوئیں۔ جا گو اور دیکھو کہ اب کس پادشاہ کی پادشاہی ہے، بیچ میں قصیدہ گو، واسوخت گو، قافیہ پیما، منشی احمد حسین قمر اور منشی محمد حسین جاہ تو ضرور ملیں گے، لیکن مسلمانوں میں کوئی کوپرنیکس، واٹ، ایڈیسن اور مارکونی نہ ملے گا۔ جس نے کی شاعری کی۔ مشاعرہ برپا کیا۔ گلدستہ سخن نکالا، یا پھر نئے فرقے پیدا کئے۔ مقلد و غیر مقلد کی بحثیں چلیں، آمین بالجہر پر فساد ہوئے ذبیحے اور رویتِ ہلال پر آ کر سفینہ کنارے لگا۔

ایمسٹرڈم میں اور برلن میں ایسے ڈپارٹمنٹل اسٹور دیکھے کہ پوری منزل کھلونے ہی کھلونے ہیں۔ ان میں گڑیاں گڈے بھی ہیں لیکن تمام مشینوں کے ماڈل بھی دیکھے جن سے پتہ چلے کہ پسٹن کیا ہوتا ہے، گیئر کیسے کام کرتے ہیں۔ ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے۔ یہی التزام یہاں کی کتابوں اور کورسوں میں ہے۔

یارو! کیا ہیں یہ قصے جن کو سینے سے لگائے پھرتے ہو۔ فارس کے شہزادوں کی کہانیاں ہیں۔ جان عالم اور بدر منیر کو کب تک روؤ گے۔ میر کی

بے زری کا نہ کر گلہ غافل
رکھ تسلی کہ یوں مقدّر تھا

کب تک ہماری نئی نسل کے کورسوں میں رہے گی۔ سکندر تو جب دنیا سے گیا تب خالی ہاتھ تھا، تم تو دنیا میں خالی ہاتھ ہو۔ غالب جیسے بھی ہستی کے فریب میں نہیں آئے۔ عالم کو حلقہ دامِ خیال جانتے رہے۔ اور ہم نے دنیا بھر کے علوم اس شاعر کے دیوان میں ڈھونڈ لئے۔ جیسے آریہ سماجی لوگ جیٹ ہوائی جہازوں کو ویدوں میں تلاش کر کے لاتے ہیں۔

اے صاحبو! دن بھر مصاحبوں کے جلو میں بیٹھے ناؤ نوش کرنے والے مجرا دیکھنے والے اور مشاعرے کرانے والے کچھ غدر کے ساتھ، کچھ پچھلی صدی کے ساتھ گئے۔ کچھ پہلی جنگ میں فنا ہوئے کچھ دوسری جنگ کے ساتھ ختم ہوئے اور 1947ء کے انقلاب

www.pakistanipoint.com

کے بعد تو ان کی ایک یادسی باقی ہے، سو وہ بھی کیا ہے اچھا ہے یہ لوگ ختم ہوئے۔ اچھا ہے ہم 1857ء کی جنگ آزادی ہار گئے ورنہ یہ بھی نہ ہوتے جو ہیں۔ مولوی محبوب عالم نے اپنے تاثرات اس وقت رقم کئے جب برطانوی راج کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ آزادی کا تصور بھی نہ تھا ان کو دو سو سال تک کچھ ہوتا نظر نہ آیا۔ ہم اتنے مایوس نہیں۔ دست و بازو بھی مضبوط رکھتے ہیں۔ موقع ملے تو ذہن کی جودت میں بھی کم نہیں۔ اک ذرا یہ شاعری اور قناعت اور سوز و گداز اور وحدت الوجود اور مراعاۃ النظیر اور ردیت ہلال وغیرہ کے مباحث نہ ہوں تو۔۔۔!

www.pakistanipoint.com

ہالینڈ

27 اکتوبر تا 5 نومبر 1967ء

www.pakistanipoint.com

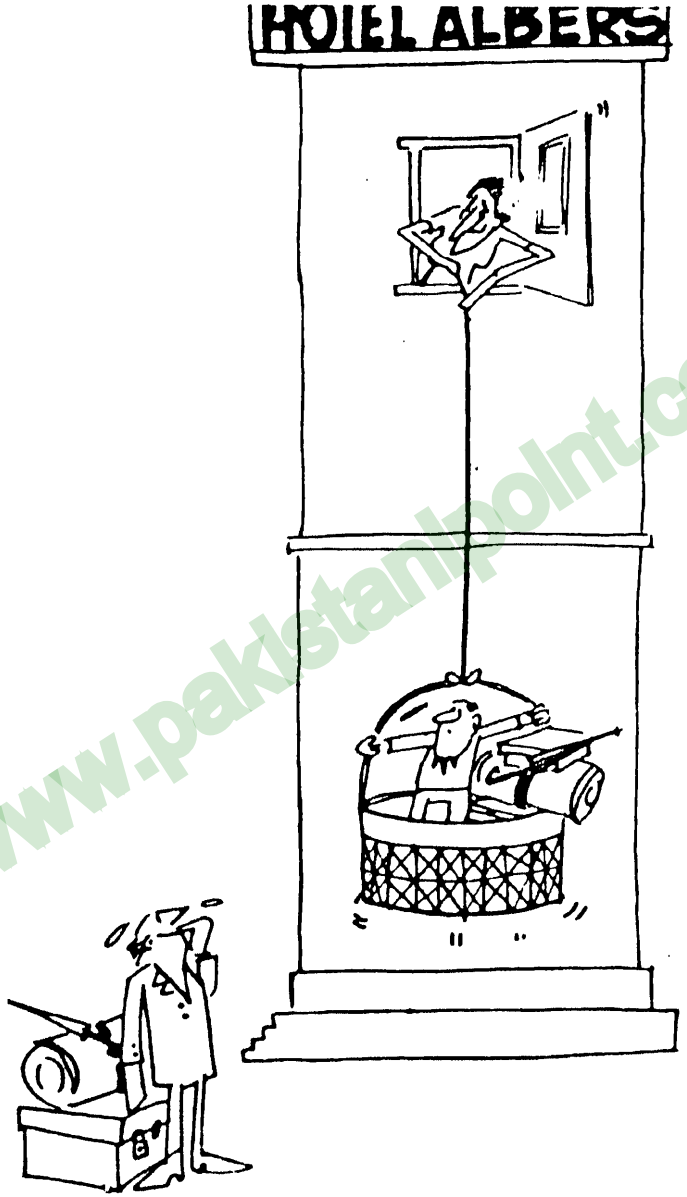

www.pakistanipoint.com

کوہ (ہوٹل) البرز کی چوٹی پر

از ایمسٹرڈم

بخدمت جناب معلیٰ القاب قدرت اللہ شہاب، سابق سفیر متعینہ ہالینڈ، خیریت موجود خیریت مطلوب!

جناب والا! کیا یہی ایمسٹرڈم ہے جہاں ریمبراں وغیرہ پیدا ہوئے تھے؟ ان لوگوں کو کوئی اور جگہ پیدا ہونے کو نہ ملی؟ جس بھٹیار خانے میں بستر پر اکڑوں بیٹھے ہم یہ سطور رقم کر رہے ہیں اس سے تو کراچی کے ٹرام پٹے والے ہوٹل ہزار درجہ اچھے جن میں مجرب سنیاسی نسخوں والے حکیم اور قسمت کا کچا چٹھا بتانے اور تقدیر بگاڑنے بنانے والے عامل کامل رہتے ہیں۔ وہ پروفیسر جن کے کمروں کے باہر لال آنکھوں اور سینگوں والے خوفناک جنوں، کھوپڑیوں اور سفلی جانوروں کی تصویروں کے پھٹے لگے رہتے ہیں۔ ہم سیدھے مغربی برلن سے آئے ہیں۔ یوں لگتا ہے۔ جیسے ٹوکیو سے میر پور خاص کی گلیوں میں پہنچ گئے ہوں۔ وہاں کی سڑکیں ایسی صاف اور مجلّا کہ ہم تو آئینہ دیکھتے ہی نہیں تھے۔ بس سڑک میں اپنا منہ دیکھ لیتے تھے۔ انتظام ہمارا ایک ایسے شاندار ہوٹل میں تھا جس کے باہر شاندار وردیوں والے چوبدار بکلوس باندھے کھڑے رہتے تھے۔ بڑھ کر دروازہ کھولتے۔ بات بات پر اور بعض اوقات بلا بات کے بھی سلیوٹ کرتے۔ ہمارا سوٹ کیس اور ہمارے ناز اٹھاتے۔ تعظیم بجالاتے ایسی ٹھاٹ کے چاوش تھے کہ ہمارا خود انہیں سلام کرنے کو جی چاہتا تھا۔ کمرہ قالین والا، مکلف، ایک طرف کو صوفہ پڑا ہے، کمرے کے

ساتھ ہی اپنا ذاتی غسل خانہ، چاہے صبح سے شام تک اس کے اندر بیٹھے اخبار پڑھتے رہو۔ چاہے بے ثباتی دنیا پر غور کرتے رہو۔ کوئی بے جا مداخلت کرنے والا نہیں کیونکہ کمرے کے باہر تختی لٹکا سکتے ہیں DON, TDISTURB یعنی خبردار اگر کوئی اندر آیا۔ دروازہ ایسا کہ ذرا سا کواڑ آپ نے بھیڑا اور خود بخود تالہ لگ گیا۔ یہاں کے دروازے کی طرح نہیں کہ اتنی بڑی چابی سے بھی آسانی سے بند نہیں ہوتا۔ لفٹ موجود ہے۔ چھٹی منزل پر نہایت جھلمل جھلمل کرتا ناشتے کا کمرہ، بیرے سفید براق یونیفارم زیب تن کئے ہوئے (جیسی ہمیں کبھی نصیب نہ ہوئی) بات بات پر بلائیں لے رہے ہیں۔ یس سر، یس سر کر رہے ہیں۔ اردو تو خیر نہیں باقی دنیا کی ہر مہذب زبان میں آپ کو مکھن لگا رہے ہیں۔ یہ بڑا شاندار لاؤنج جس میں ہم اپنی ترجمان مس فرانسسکا کو بٹھاتے تھے۔ یہ بی بی فرانسسکا ہمارے یہاں کے میزبانوں نے ہمارے ساتھ لگا دی تھی۔ کسی کالج میں پڑھتی ہے۔ ہمیں ہوائی اڈے پر لینے آئی۔ چھوڑنے آئی۔ ہمہ وقت ساتھ رہی۔ ٹیکسی کا کرایہ بھی ہمارے میزبانوں کے حساب میں خود دیتی تھی۔ البتہ اس کو دوپہر کا کھانا ہم اپنے پلّے سے کھلاتے تھے۔ خیر اس کا ملال نہیں کیونکہ ہم تو اس کا روٹی کپڑے پاندان وغیرہ کا پورا خرچ اٹھانے کو بھی تیار ہو جاتے۔ ویسے اس کو لنچ کھلانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ برلن سے رخصتی کے وقت ہوٹل کا بل دینے کے بعد ہمارے پاس بیروں کی فوج ظفر موج کو بخشیش دینے اور ایئرپورٹ ٹیکس ادا کرنے تک کا پیسہ نہ تھا۔ ہم نے دو دو تین پونڈ تڑوائے جو لندن والے الاؤنس میں سے آلو مٹر کھا کھا کر اور پیدل چل چل کر بچائے تھے۔ کرایہ برلن والے ہوٹل کا کچھ زیادہ نہ تھا۔ سولہ مارک روزانہ تھا۔ یعنی چار ڈالر، اور یاد رہے کہ غسل خانے سمیت جس میں خوشبودار صابن کی ٹکیہ اور چار تولیے، ہر روز بدلے جاتے تھے۔ ساڑھے تین مارک کا ناشتہ۔ ویسے ہم رئیس ابن رئیس ایک انڈا بھی ساتھ کھاتے تھے۔ جس کے

کچھ پیسے مزید ہوتے تھے۔ اس پر پندرہ فی صدی سروس چارج۔ باوجود اس ٹاٹھ باٹھ کے ہمارے روزینے میں سے جو 45 مارک تھا۔ ہمارے کھانے (اور کھلانے) اور مشرقی برلن دیکھنے کے لیے کوئی بیس مارک رہ جاتے تھے۔ یہاں ہمارا روزینہ بتیس گلڈ، ہوٹل سولہ گلڈر۔ پندرہ فی صدی اس کے علاوہ، کھانے کی ابھی نوبت نہیں آئی۔ بس رات بسکٹ کھا کر پانی پی لیا تھا۔ یہی لیل ونہار رہے تو یہاں بسکٹوں اور سینڈوچ وغیرہ پر گزر ہوگی۔ کھانا کھانے کی نوبت اگلی منزل پر ہی آئے گی۔

اس ہوٹل کا انتظام ہماری ایئر لائن والوں نے (ہمارے خرچ پر) کیا تھا۔ ایئر ٹرمینل سے کوئی آدھی فرلانگ دور تھا لیکن ٹیکسی والے نے کہا جی ڈھائی گلڈر (ایک پونڈ میں دس گلڈر سے کچھ کم ہوتے ہیں) ہو گئے۔ کراچی میں اتنے فاصلے کے پچاس پیسے ہوتے۔ ہمارے پاس خوردہ نہیں تھا۔ ہم نے تین دیئے اس نے جھٹ جیب میں ڈال لئے اور فرمایا IS IT O.K?۔ یعنی آدھا گلڈر بخشیش تم کافی سمجھتے ہو یا اور دو گے؟ اس سے بھگت کر اور سڑک سے خود ہی سوٹ کیس اٹھا کر اس دروازے پر پہنچے جس پر چھوٹی سی تختی البرز ہوٹل کی لگی تھی۔ تو ہمارے گھنٹی بجانے پر اندر کھٹکا سا ہوا اور دروازہ کھل گیا۔ ہمارے ہوش ہوا ہو گئے۔ کیونکہ اندر کمرہ یا لاؤنج یا دفتر نہیں تھا بلکہ سیڑھیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ حد نظر تک چلا گیا تھا اور تقریباً عمودی سلسلہ نوے کا نہیں تو 85 درجہ کا ضرور بنتا ہوگا۔ عرض سیڑھی کا تقریباً 4 انچ، پاؤں کی اگلی انگلیاں رکھ کر چڑھو، پورا پیر رکھنے کی گنجائش نہیں۔ ہم لوٹنے کو تھے کہ اوپر اس کوئیں کی منڈیر پر سے آواز آئی۔ ''گڈ آفٹرنون۔ دروازہ بند کر دینا۔'' یہ وہ بڑھیا تھیں جو اس کی مالک، بیرا، خانساماں، جھاڑو و بہارو والی غرضیکہ سب کچھ تھیں۔ دروازے کی چٹخنی کے ساتھ انہوں نے ادوائن کی ایک رسّی باندھ رکھی تھی۔ جو دیوار کے ساتھ ساتھ کنڈیوں میں سے ہوتی ہوئی اوپر ان کے کمرے تک چلی گئی تھی۔

www.pakistanipoint.com

قسمت کا مارا مسافر باہر سے گھنٹی بجاتا ہے تو وہیں بیٹھے بیٹھے اس رسی کو ایک زور کا جھٹکا دیتی ہیں اور دروازہ کھٹ سے کھل جاتا ہے۔ پھر تاکید کرتی ہے کہ بند کر کے آنا۔ ہمارے کمرے تک آنے کے لئے 75 سیڑھیاں پڑتی ہیں۔ ہوٹل البرز سے، شروع میں ہم سمجھتے تھے کہ یہ البرز کسی کا نام ہوگا۔ کوہ البرز کی نسبت کی طرف دھیان نہ گیا تھا۔ کمرے کے ساتھ غسل خانہ اور دوسری حاجاتِ ضروریہ غیر ضروریہ کا کیا سوال؟ اس سردی میں کمرہ گرم رکھنے تک کا انتظام نہیں۔ ایک پرانا ہیٹر اٹھا کر لائیں جو بابا آدم نہیں تو ریمبران صاحب کے استعمال میں ضرور رہا ہوگا۔ فرمایا بہت سردی لگے تو اسے جلا لینا۔ لیکن بجلی کا سوراخ ایک ہی ہے اسے لگاؤ تو پڑھنے کا لیمپ بند کرو۔ دوہری عیاشی نہیں کر سکتے۔

ناشتے کے لئے پوچھا کہ کے بجے کرتے ہو۔ ہم ذرا دیر خیز ہیں لیکن یہاں صبح بہت جلدی ہوتی ہے لہٰذا کہا۔ یہی کوئی آٹھ بجے۔ فرمایا۔ یہ تو بہت جلدی ہوا۔ سردی ہے، میں ذرا دیر سے اٹھتی ہوں۔ نو بجے کرو تو اچھا ہے جب معلوم ہوا کہ ہم پاکستان کے ہیں تو بولیں! پاکستان کے لوگ اس ہوٹل کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ایک مسٹر خان ہیں تم جانتے ہو گے وہ تو ہر سال یہیں آ کر ٹھہرتے ہیں۔

یہ وہ شہر ہے جس میں آپ تین سال تک ہز ایکسی لنسی رہے۔ سنا ہے یہاں سفارت خانہ اور سفیر کبیر کا گھر ایک محل ہے جو ہماری حکومت نے اچھے دنوں میں خرید لیا تھا۔ آپ کے اخلاق کریمانہ پر نظر کرتے ہوئے کچھ عجب نہ تھا کہ ہم بھی اس کے کسی کونے میں فروکش ہو جاتے اور ہفتہ بھر آپ کی روٹیاں توڑتے۔ آخر پاکستان سے جانے والے اتنے لوگ یہی کرتے رہے ہیں۔ بعضوں کو تو سنا ہے کہ آپ نے پرزور اصرار کر کے اور پلے سے کرایہ دے کر وطن واپس جانے پر آمادہ کیا تھا۔ ہم چھ سال قبل بھی کچھ دن اس شہر میں گزار گئے ہیں۔ ہوٹل اس وقت بھی کچھ ایسا اچھا نہ ملا تھا۔ لیکن کم از کم اس کا دروازہ

ادوائن کی رسی سے نہ کھلتا تھا۔ ہوٹل بالکل نیشنل میوزیم کے ساتھ والی گلی میں ہے۔ یہ میوزیم انیسویں صدی کے وسط میں بنا تھا۔ گویا ہمارے اس ہوٹل کے مقابلے میں اس کی عمر جمعہ جمعہ آٹھ دن جانی چاہیے۔ آج ہمارا گزر ایمسٹرڈم ہلٹن کے سامنے سے بھی ہوا۔ یہ ہمارے ہوٹل کے مقابلے میں بہتر معلوم ہوا لیکن ہم اپنا پانچ دن کا الاؤنس جمع کریں، تو وہاں ایک شب قیام کر سکتے ہیں یہ تو کر لیں لیکن یہ باقی کی چار راتیں کہاں گزاریں

اے غمِ دل کیا کروں
اے وحشتِ دل کیا کروں

www.pakistanipoint.com

ہالینڈ ہم کو پسند آیا

ایمسٹرڈیم تو جیسا ہے سو ہے۔ نہروں کا ایک جال ہے۔ ہمارا خیال تھا، نہروں کی یہ اسکیم خوبصورتی کے لئے رکھی گئی ہے۔ پتہ چلا کہ یہ بات نہیں۔ پہلے چھوٹا سا شہر تھا۔ بیرونی حملے کے ڈر سے نہر کھودی گئی۔ پل تھے جو اٹھائے جا سکتے تھے۔ آبادی بڑھی تو نہر کے دوسرے کنارے کے ساتھ ساتھ حویلیاں اور مکان بن گئے۔ اس کی حفاظت کے لئے پہلی نہر کے متوازی نہر کا دوسرا حصار کھینچا گیا۔ پھر تیسرا، پھر چوتھا، پانچواں، چھٹا، ساتواں، آٹھواں وغیرہ اور یوں جس طرح درخت کے تنے کے حلقے دیکھ کر آپ اس کی عمر کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ایمسٹرڈم کا نقشہ دیکھ کر معلوم ہو سکتا ہے کہ کتنی نسلیں اور کتنی صدیاں اس شہر پر سے گزری ہیں۔ گول مول بات ہم اس لئے بھی کر رہے ہیں کہ جس کاغذ پر اس شہر کا سال تعمیر، نہروں اور پلوں کی صحیح تعداد وغیرہ لکھے تھے ہم سے کھو گیا ہے۔

ڈچ لوگ اور ان کا شہر ہمیں پسند آئے۔ یورپ کے بعض دوسرے ملکوں کی طرح ان لوگوں کو صفائی کا جنون نہیں ہے۔ آرٹسٹ لوگ ہیں۔ لندن میں تو جگہ جگہ لکھا ہے کہ اگر سڑک پر تھوکا یا کاغذ کا کوئی پرزہ پھینکا تو ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔ ہالینڈ میں اس قسم کی کوئی ناروا پابندی نہیں ہے، کئی بار تو یہ خوش گوار احساس ہوتا تھا کہ ہم اپنے ہی ملک میں ہیں کوئی چیز اجنبی نہیں۔ بارش ہے تو کیچڑ ہے۔ کار بھی چھپ چھپ چھینٹے اڑائی گزر گئی ہے۔ کوئی مکان تعمیر ہو رہا ہے تو جرمنی یا انگلستان میں اس کے گرد پردہ کھنچا پڑتا ہے۔ ہمارے ملک کی طرح یہ لطف نہیں کہ آپ فٹ پاتھ سے گزر رہے ہیں اور اوپر سے سیمنٹ اور ریت نیچے گر رہے

www.pakistanipoint.com

ہیں، اینٹیں آ رہی ہیں۔ یہاں ایک فٹ پاتھ سے گزرتے ہوئے ہم پر اوپر سے گارا گرا تو سچ یہ ہے کہ اس میں سے اپنے وطن کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو آئی۔ ملک سے دوری کا غم ہٹ گیا۔ کاغذ چاک کر کے اس کے پرزے بھی ہم نے جہاں چاہا پھینکے۔ کسی کے ابرو پر بل نہ آئے۔ سڑک کو بھی ہم نے جا و بیجا کراس کیا۔ جرمنی میں ہم لال بتی پر رک کر اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ بہت سے ہوٹلوں اور طعام خانوں میں بھی صفائی کا معیار ہمارے ملک کے ایرانی ہوٹلوں کا سا تھا، اس سے کم نہیں تھا۔ مانگنے والے بھی اتنے تو خیر نہیں تھے جتنے صدر ملتے ہیں تاہم کہیں کہیں ملے۔ سڑک پر ایک ٹھیلا سا کھڑا کر رکھا ہے جس میں گراموفون لگا ہے جو بلند آواز سے پرسوز گانا گا کر راہگیروں کے دل میں جذبۂ ترحم پیدا کر رہا ہے اور ایک شخص اپنا پیالہ لئے ہوئے اس میں سکے چھنکاتا لوگوں کا راستہ روک رہا ہے۔ البتہ بسیں، ٹرامیں ان ظالموں نے نئی بنا دی ہیں۔ ریمبر اں کے عہد کی نہیں رکھیں۔ یا پھر تعلیم کا معیار اچھا ہے۔ کتابیں خوبصورت چھپتی ہیں۔ چیزیں خالص ملتی ہیں، لوگ با اخلاق ہیں۔ نائی بھی اچھے ہیں۔ ہم نے یہاں آ کر بال کٹائے۔ لندن والے نائی سے تو بہتر نکلا پیسے بھی کم لئے، تھینک یو بھی بڑے تپاک سے کہا۔

ہاں تو کہنا یہ تھا کہ ایمسٹرڈم تو جیسا ہے سو ہے۔ ڈیلفٹ اور لیڈن دونوں کی خوبصورتی نے ہمارا جی موہ لیا۔ ڈیلفٹ تو ہم کام سے گئے تھے، ایک صاحب سے ملاقات کی ٹھہری تھی، اس کے بعد ہم نے از خود ٹاؤن ہال کے گرد کے حصے کا چکر کاٹا۔ ڈیلفٹ میں ایک تو چینی مٹی کی صنعت پرانی ہے۔ ظروف پر، ٹائلوں پر نیلی نقش کاری یہاں کا خاص فن ہے۔ وہی رنگ کہ ملتان کی خصوصیت ہے، ڈیلفٹ میں برتا جاتا ہے اس کے علاوہ لکڑی کے جوتے زیادہ تر اب سیاحوں کی تفریح طبع کے لئے بنتے ہیں، لیکن ہم نے ایک شخص کو پہنے ہوئے بھی دیکھا۔ معلوم ہوا سردیوں میں آرام رہتا ہے۔ لیڈن میں ہم کو علم کا شوق لے گیا تھا۔ کچھ ہمارا خیال تھا (جو غلط نکلا) کہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی ترتیب و تدوین بھی لیڈن ہی میں ہوتی ہے۔ ہمیں بھی کچھ معلومات اسلام کی ہیں ہمارا ارادہ تھا ان لوگوں کو بتا کر

آتے لیکن پتہ چلا کہ یہاں کے ایک ادارے کو فقط اس کی اشاعت میں دخل ہے۔ لائبریری کا اورینٹل شعبہ دیکھنے کا بھی ہم نے خاص اہتمام کیا تھا۔ ہمارا خیال تھا وہاں جا بجا لوگ جبے پہنے ڈچ لہجے میں عربی فارسی بولتے نظر آئیں گے، لیکن ایسا نہ ہوا۔ لائبریرین صاحب، کچھ بھلا سا نام تھا ان کا، شاید عربی جانتے تھے۔ بہر حال کتابوں کے نام پڑھ لیتے تھے۔ ہم نے اُردو کی کتابیں دیکھنے کی خواہش کی۔ فقط ماسکو کی چھپی ہوئی اُردو روسی لغت نکلی اور کچھ بھی نہیں۔ اس سے زیادہ کتابیں تو وہاں گورمکھی کی تھیں، گورمکھی کے متعلق بھی تھیں۔ ہاں عربی کا ذخیرہ کچھ ہے۔ یا پھر چینی جاپانی کا اور انڈونیشی ملائی کا۔ ہم کتب خانے کی کہنگی سے ضرور متاثر ہوئے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ڈچ زبان کی پرانی کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے جرمنی اور انگریزی کی کتابیں بھی خاصی ہیں۔ ہمارا شوق الف لیلہ اور اس کے تراجم ہیں، سو چند نسخے دیکھے۔ جو اور جگہ نہ ملے تھے۔ ان سے قطع نظر جیسے گئے ویسے ہی ہر پھر کے آ گئے۔

لیکن ہمیں ڈیلفٹ اور لیڈن کی گلیوں کوچوں نے بہت متاثر کیا۔ خوبصورت ٹائلوں والے مکانات، نہر لیڈن کے اندر سے بھی گزرتی ہے۔ سیر کرتے ہم پرانے ٹاؤن ہال کی طرف جا نکلے۔ سڑک کے سرے پر ایک پون چکی بھی تھی۔ مکانوں کا انداز وہی سترہویں اٹھارہویں صدی کا۔ سکائی سکریپروں یعنی فلک نما مکانوں کی بدعت فقط راٹرڈم میں دیکھی، کیونکہ وہ شہر عالمی جنگ کی بمباری میں ملبے کا ڈھیر رہ گیا تھا، نئی تعمیرات بلند، مہیب اور چوکور ہیں۔ ایمسٹرڈم بھی پرانے تاجروں اور رئیسوں کی حویلیوں کا شہر ہے لیکن لیڈن اور ڈیلفٹ کے نکیلی چھتوں اور گیلری والے مکانات تو اپنی الگ ہی دلآویزی رکھتے ہیں۔ غازے سے بے نیاز گاؤں کی الھڑ دوشیزاؤں کی طرح۔

ایمسٹرڈم کا مشہور ٹروپن میوزیم جس میں مختلف استوائی ملکوں کے رہن سہن کا انداز دکھایا گیا ہے۔ ان کے ملبوسات، گھر، گھروں کا سامان، زیور، ظروف، باجے گاجے اوضاع، اطوار یہ ہم نے آنے کے پہلے ہی روز دیکھ لیا تھا۔ اتھنولوجیکل میوزیم ہمارا خاص

www.pakistanipoint.com

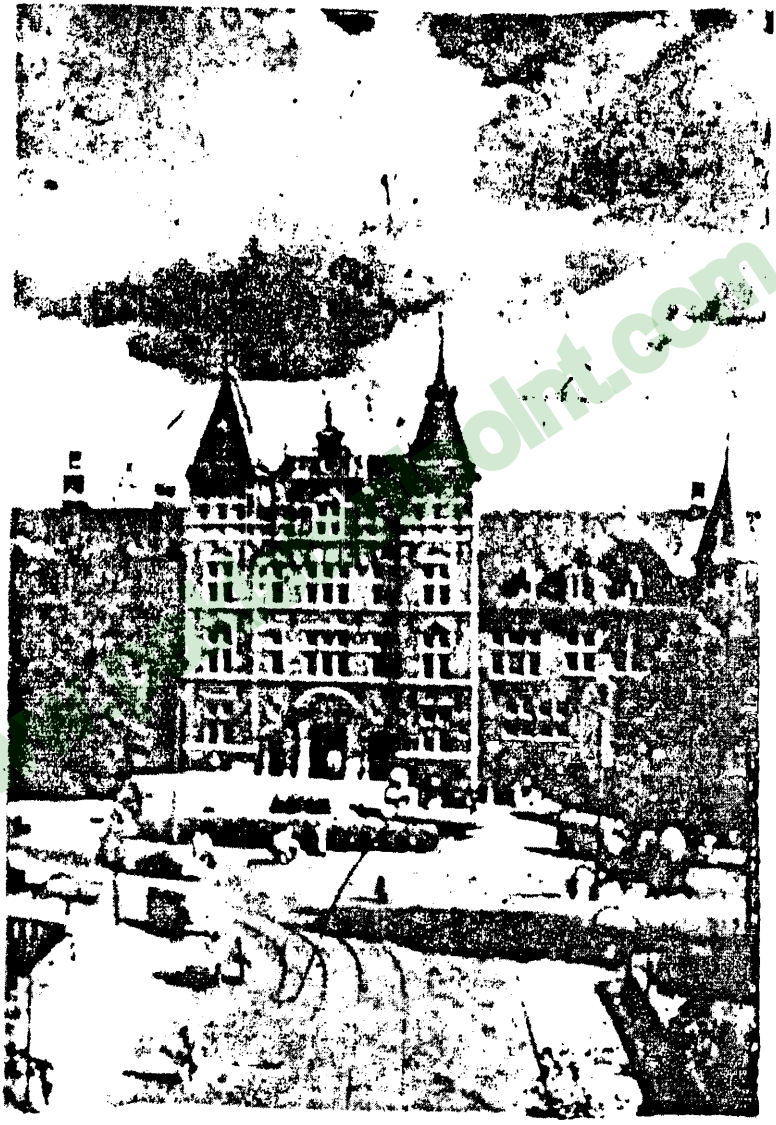

ایمسٹرڈیم کا ٹروبن میوزیم

www.iqbalcyberlibrary.net

شوق ہیں۔ برلن کے فوکر کنڈے، یعنی معاشرتی میوزیم کا حال ہم نے مولوی محبوب عالم کے سفرنامے میں پڑھا تھا۔ کشاں کشاں پہنچے۔ افریقی اور چینی جاپانی شعبے تو دیکھے، لیکن وہ شعبہ جو اس برعظیم سے تعلق رکھتا ہے، مرمت کے لئے بند تھا، سخت مایوسی ہوئی۔ عمارت وہی ہے جو اس صدی کے آغاز میں تھی۔ مولوی محبوب عالم نے لکھا ہے کہ ''پنجاب کے متعلق ذخیرہ کافی نہ تھا۔ گو لاہور کے کسیرے بازار کی آٹھ آنے والی ایک چارپائی بھی پڑی تھی لیکن اس سے لوگ یہی نتیجہ نکالتے ہوں گے کہ ہندوستانی صرف ایسی ہی چارپائیاں استعمال کرتے ہیں۔ ایک صادق الاخبار بہاولپور کا نمونہ سیالکوٹی کاغذ پر چھپا ہوا رکھا تھا۔ میں نے وہاں رکھنے کے لئے پیسہ اخبار اور انتخاب لاجواب کے نمونے مع ایک لکھے ہوئے مراسلہ کے جو اتفاقاً میرے پاس تھا، عجائب گاہ کے اعلیٰ افسر کے پاس بھجوا دیئے جس نے مجھے بعد میں شکریے کا خط بھیجا۔''

ہمارے یہ میوزیم پورا نہ دیکھ پانے کی کچھ تلافی ایمسٹرڈم کے ٹروپن میوزیم کو دیکھ کر ہوگئی۔ افریقہ اور انڈونیشیا کے شعبے خاصے بڑے ہیں اور ایشیا کے بعد اور ملکوں کے بھی جن کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ہمیں توہمات اور پسماندگی کو جھٹکنے میں ابھی کتنے قرن لگیں گے۔ ایک جگہ بدوؤں کا خیمہ بھی تنا ہے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ بیسویں صدی کی معاشرت ہے۔ ایک جگہ ایک پاکستانی عورت لٹھے کے سیدھے برقعے میں کھڑی نظر آئی۔ بعض اور اسلامی ملکوں کے برقعے تو اور بھی کمال ہیں لیکن پاکستان کے شعبے میں ایک محترمہ کو ریشمی غرارہ پہنے اور پرس اٹھائے بھی دکھایا گیا ہے۔ ایک کونے میں ایک شعبہ اسلام کا ہے۔ مسلمانوں کو نماز پڑھتے دکھایا گیا ہے۔ خانہ کعبہ اور حج کی رسوم بھی دکھائی گئی ہیں۔ اس شعبے میں مختلف مسجدوں کے نمونے بھی رکھے گئے ہیں اور ایک طرف قرآن مجید اور اس کے تراجم مختلف زبانوں میں۔ اچھا اثر آفریں شعبہ ہے۔ برما اور انڈونیشیا وغیرہ کے تو پورے گھر اور دکانیں ہیں۔ ان دکانوں میں نون تیل پورا اصلی ساز و سامان بھرا ہے۔ بس اندر دکاندار مصنوعی ہے۔

www.pakistanipoint.com

ہالینڈ کے راستوں میں تنہا

لیجئے۔ آج چھ راتیں وہاں گزارنے کے بعد ہم ہوٹل البرز سے چلے آئے اور وہ بند ہو گیا۔ کم از کم عارضی طور پر، کیونکہ اس ہوٹل میں ہم تنہا مسافر تھے۔ ناشتے کی واحد میز پر صرف ہمارے لئے ناشتے کا انتظام ہوتا تھا۔ فقط ہمارا بستر بچھتا تھا۔ مسز البرز بازار سے فقط دو انڈے اور ایک ڈبل روٹی لاتی تھیں۔ ایک ہمارے لئے، ایک اپنے لئے۔ بلکہ ہمارا خیال ہے بازار جاتی ہی نہیں تھیں۔ کیونکہ ادوائن کی رسی کے ساتھ ساتھ سیڑھیوں میں ہم نے ایک اور تار سی بندھی دیکھی جس کے سرے پر چھینکا لٹکا ہوا تھا۔ انڈے ڈبل روٹی والا صبح صبح آ کر گھنٹی بجاتا تھا۔ مسز البرز، ادوائن کو جھٹکا دیتیں اور دروازہ کھل جاتا۔ وہ چھینکے میں سامان خورد و نوش رکھ کر اور گڈ مارننگ کا آوازہ بلند کر کے دروازہ بند کر دیتا۔ اور یوں یہ ہوٹل چل رہا تھا اور ہم اس میں چل رہے تھے اور کرایہ مع 15 فیصدی سروس کے دے رہے تھے۔ قاعدے سے یہ 15 فیصدی سروس ہمارا حق بنتا تھا کیونکہ ہوٹل کے مسافر (خواہ وہ ہم خود ہی تھے) کا سامان اوپر چڑھانا اتارنا ہمارا کام تھا۔ دروازہ کھولتے بند کرتے ہم خود تھے۔ کوئی فون آتا تھا تو دوڑے دوڑے کاریڈور میں ہم جاتے تھے۔ صابون ہم اپنا برتتے تھے۔ جوتے ہم اپنے خود پالش کرتے تھے۔ رات کو اس ہوٹل میں عجیب سناٹا

www.pakistanipoint.com

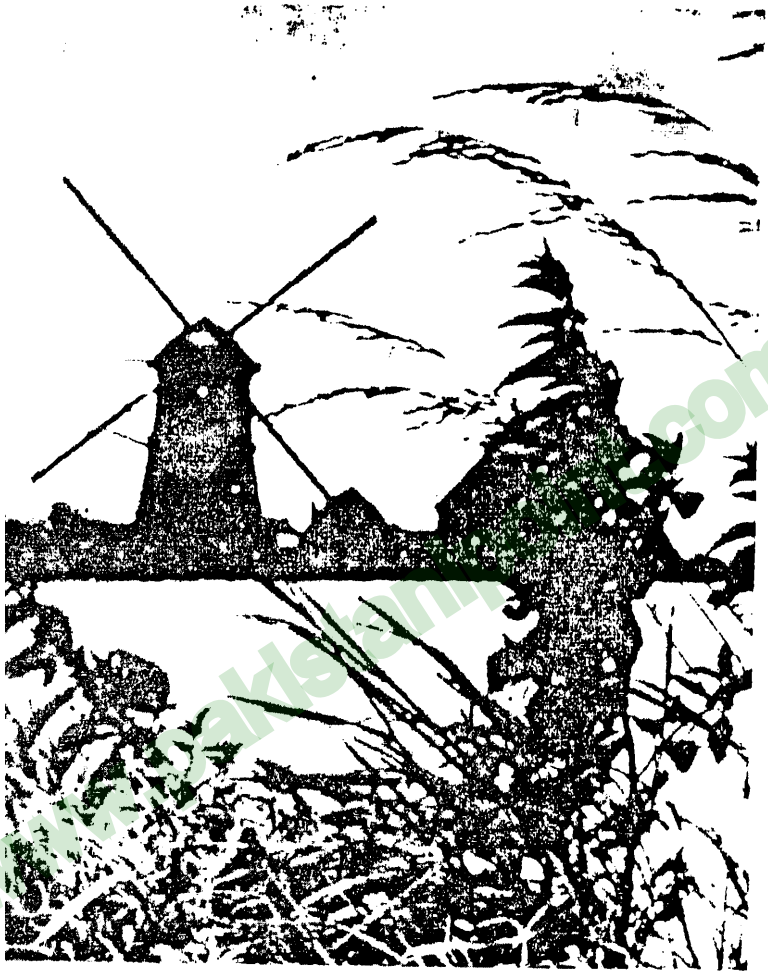

رکنے کی نہیں جا اٹھ بھی چکو
کسی اور نگر چلیں اجنبیو
سینے میں لیے سینے کی دکھن
آتی ہے پون جاتی ہے پون

www.pakistanipoint.com

منظر بھی حسیں، چہرے بھی حسیں
ایسے کہ کبھی دیکھے بھی نہیں
اپنے لیے تھے تو شہر نہ بن
آتی ہے پون جاتی ہے پون

www.pakistanipoint.com

ہوتا تھا۔اس کی تیسری منزل پر ڈیوڑھی والے کمرے میں ہم، نیچے نہ جانے کہاں مسز البرز۔انگریزی بولتی ضرور تھیں لیکن زبانِ میر اور کلامِ میرزا کی طرح خود ہی سمجھتی ہوں گی۔ ہماری خدمت نہ کر سکنے کا انہیں ملال تھا کیونکہ بقول ان کے ان کی صحت اچھی نہ رہتی تھی۔ حالانکہ عمران کی 67 سال سے زیادہ نہ تھی۔ہمیں ان کا ہوٹل چھوڑنے کا قلق ضرور ہوا۔ لیکن یہ خوشی ہے کہ بیچاری کو اب کسی مسافر کے لئے ناشتے وغیرہ کا تردد نہ کرنا پڑے گا۔کل صبح آرام سے پاؤں پسار کے سوئیں گی۔ یہ امکان کم معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شامت کا مارا مسافر وہاں آنکلے۔ایک روز ایک شخص آیا ضرور تھا۔کمرے دیکھنے کے بعد بولا۔''اچھا میں ابھی آیا''۔لیکن

جو مجھے دیکھنے کو آتا ہے
پھر مجھے دیکھنے نہیں آتا

اب ہم میوزیم ہوٹل میں ہیں۔جو بالکل ساتھ والی گلی میں ہے۔مسز البرز سے ہم نے جھوٹ بولا ہے کہ ہم دوسرے شہر ہیگ میں جا رہے ہیں کیونکہ اب ہمارا کام وہاں ہے، ایمسٹرڈم میں نہیں ہے۔ہم سعدی کے چیلے ہیں۔دروغ مصلحت آمیز کے قائل ہیں۔ہمارا یہ اچھا صاف ستھرا کمرہ ہے۔سیڑھیاں بھی ہوٹل البرز کے مقابلے میں آدھی۔ہُو کا عالم بھی نہیں ہے کیونکہ نیچے سامان اٹھانے کو ہری جیکٹ والے دربان، کونٹر پر دو لڑکیاں، ایک طرف کو ناشتے کا کمرہ اور ریستوران جس میں مکلف وردیوں والے سے بیرے ترت پھرت کرتے نظر آ رہے ہیں۔مسافروں کی ریل پیل۔مرکزی ہیٹنگ بھی ہے۔مسز البرز نے ہمیں ہیٹر کہہ کر جو آلہ دیا تھا اس میں سے ہوا تو آتی تھی۔گرمی ہم نے نہ دیکھی۔اسے کئی بار اٹھا کر ہم نے گود میں بھی رکھا کچھ فائدہ نہ ہوا۔شب بھر ٹھٹھر ٹھٹھر کرتے تھے۔تولیے کی جگہ چار گرے کا ایک رومال تھا اور اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب یہ تھی کہ چھ دن میں تو بدلا

www.pakistanipoint.com

نہیں گیا۔ واش بیسن میں ڈاٹ تو لگتی ہی نہیں تھی۔ دو ٹکڑے ہو گئی تھی اور گرم پانی کی ٹونٹی کھولئے تو کھولتے چلے جایئے۔ دو تین منٹ کے بعد ٹپکا شروع ہوتا تھا۔ غالباً پانی بھی سیدھا پائپ سے نہیں بلکہ سیڑھیاں چڑھ کر ہانپتا کانپتا آتا تھا لیکن ٹھنڈا پانی تو خوب فوارے کی طرح آتا تھا۔ اس میوزیم ہوٹل کے کمرے کی دیوار کو ہم نے ٹہوکا دیا۔ ٹھوس دیواریں تھیں بلکہ ایک پرتو لکڑی کے خوبصورت تختے بھی لگے ہیں۔ ہوٹل البرز میں ہمارے کمرے کی دیواریں تحقیق نہ ہوا کہ کس مسالے کی تھیں۔ انگلی سے دباؤ تو اتنی دیوار اندر کو دب جاتی تھی۔ ہمارا خیال ہے موٹا کاغذ تھا اس کے پیچھے خلا تھا اور خلا کے پیچھے جانے کیا۔ کچھ نہ کچھ تو ہوگا۔ خلا کی کھوج لگانے کا جنون روسیوں کو ہے، ہمیں نہیں ہے۔

مصروفیت سنیئے کہ صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے۔ عمر یونہی تمام ہوتی ہے اور ہمارا کام تمام کرتی ہے۔ ہر روز ایک نئی منزل سر پر کھڑی ملتی ہے کل صبح 9 بجے ایک صاحب سے ڈلفٹ میں ملنا تھا۔ ایمسٹرڈیم سے گاڑی 7:45 پر چلتی ہے اور 8:45 پر پہنچاتی ہے۔ 7:54 پر چلنے کے لئے اسٹیشن پر پندرہ بیس منٹ پہلے پہنچو۔ ٹکٹ لو اور پلیٹ فارم تلاش کرو۔ اس کے لیے آدھ میل دور جا کر سولہ نمبر کی ٹرام پکڑنی چاہیے۔ اس کے لئے گھر سے کم از کم سات بجے چلو۔ اور چونکہ فیشن کا انتظامِ صفائی بھی ضروری ہے۔ یعنی شیو کرو۔ منہ ہاتھ دھوؤ۔ کپڑے پہنو تو چھ بجے اٹھو۔ یعنی نور کے تڑکے۔ ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں؟ خیر مسز البرز سے ٹائم پیس مانگا۔ ڈلفٹ گئے۔ انہوں نے پہلے ہی فون کر رکھے تھے، ایک اور شہر میں راٹرڈم میں۔ نیا ٹکٹ لیا اور وہاں بھی جا اترے۔ وہاں کے کام بھگتائے تو پھر ہیگ آئے۔ کیونکہ ہیگ کے پاس ایک قصبہ ہے جہاں وزارت خارجہ کے دفاتر ہیں اور وزارت خارجہ کے ایک افسر ہماری ملاقات کا اشتیاق رکھتے تھے بشرطیکہ ہم ان کے پاس پہنچیں۔ یہ تجربہ ہم کبھی نہ بھولیں گے۔ یہاں کے لوگ بے حد با اخلاق ہیں۔ اگر ان کو کوئی راستہ معلوم نہیں تو بھی ٹکہ سا جواب

ریل کی لائن تھی۔۔اوراس پار خالی کھیت تھے۔

ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے۔ان صاحب سے ملنا بھی ضرور تھا کیونکہ بات ہمارے مفاد کی نہیں۔ہمارے ملک کے مفاد کی تھی۔شام بھی ہو رہی تھی۔پھر ہم بس کا راستہ بھی بھول چکے تھے۔پھر ٹرام لینی تھی۔پھر ہیگ سے گاڑی پکڑنی تھی پھر ٹرام لینی تھی۔پھر پیدل چلنا تھا۔پھر مسز البرز کے ہوٹل کی 57 سیڑھیاں چڑھنی تھیں۔منزل تیری دور مسافر، منزل تیری دور۔

آخر جب ہم مایوس ہو چکے تھے۔اتفاقاً وہ دفتر ہمیں مل گیا۔صاحب موصوف البتہ نہیں تھے۔ہم خستگی سے بے ہوش ہونے کو تھے کہ وہ آ گئے۔بولے ''امید ہے آپ کا سفر خوشگوار گزرا ہوگا اور یہاں کا راستہ آسانی سے مل گیا ہوگا؟''

ہم جی کڑا کر کے چہرے پر مسکراہٹ لائے اور کہا۔''جی ہاں!''

آج شام ہمیں علم کا شوق اور فرض کی محبت لیڈن لے گئی۔وہاں سے بھی بارش میں شرابور چھپ چھپ کرتے آئے اس وقت ہمارا کوٹ وارڈ روب میں لٹکا نچڑ رہا ہے اور جوتا بھی۔کل صبح پھر شہر سے باہر ایک اپائنٹ منٹ ہے۔ہمارا جی ابھی سے ہول کھا رہا ہے۔آپ کہیں گے ہم کیوں نہیں فون کر کے ٹیکسی طلب کرتے۔ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اور پتے کی پرچی ڈرائیور کے حوالے کر کے نچنت ہو جاتے اور سگریٹ سلگا لیتے، وہ جانے اس کا کام۔

ہمارے اس تھوڑے لکھے کو بہت جانئے کہ اس کی وجوہ اقتصادی ہیں۔

www.pakistanipoint.com

ایمسٹرڈیم کے رجح میوزیم میں

www.pakistanipoint.com

ہمیں بھی آرٹ سے رغبت ہے

ایمسٹرڈم میں جب ہم اپنے کاموں سے کچھ کچھ فارغ ہوئے تو ایک صاحب سے ہم نے پوچھا۔ اب ہمارا یہاں سے چل چلاؤ ہے ہم نہیں چاہتے کوئی چیز ہمارے دیکھنے سے رہ جائے۔ یہاں کی کیا کیا چیزیں مشہور ہیں؟

بولے: ''پنیر''

ہم نے کہا۔ ''وہ ہم نے کھالیا، بلکہ قدرت اللہ شہاب صاحب کے ہاں کھا کے آئے تھے۔ وہ دو تین سال کا ذخیرہ اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔''

''دوسری چیز یہاں کی پون چکیاں ہیں''۔

ہم نے کہا ''وہ بھی دیکھ لیں.....اور''؟

سوچ کر بولے: ''یہاں کے پینٹر مشہور زمانہ ہیں۔''

ہم نے ان کے گھر کے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی چوکھٹ پر ہاتھ پھیرا۔

بولے: ''میرا مطلب دروازوں، کھڑکیوں پر رنگ کرنے والوں سے نہیں ہے پینٹر تم نہیں جانتے کیا ہوتا ہے؟''

اب کچھ کچھ ہماری سمجھ میں آیا۔ ہم نے کہا ''معاف کرنا۔ اب ہم سمجھے۔ ہمارے ہاں بھی بڑے اچھے اچھے پینٹر ہیں ایک سے ایک عمدہ سائن بورڈ آپ کو نظر آئے گا بلکہ شہر کی دیواروں پر لکھنے والوں میں ایک نامی گرامی پینٹر اللہ دیا ممتاز ہمارے پڑوس میں رہتا ہے۔ شاعر بھی ہے۔ ممتاز اس کا تخلص ہے۔

www.pakistanipoint.com

تخلص جانتے ہو کیا ہوتا ہے:

فرمایا: ''میرا مطلب دیواریں چھاپنے والے یا سینما کے بورڈ بنانے والے پینٹروں سے بھی نہیں ہے۔ ریمبران کا نام تم نے سنا ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''ایک ہفتہ تو ہمیں یہاں آئے ہوا ہے۔ اس میں بھی زیادہ تر مصروفیت رہی۔ آپ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ رام رام..... کیا نام بتایا تم نے اس کا؟''

انہوں نے روکھے پن سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

ریخ میوزیم یعنی قومی میوزیم بالکل ہمارے میوزیم ہوٹل کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ معلوم نہیں ہمارے ہوٹل کا نام اس کی وجہ سے رکھا گیا ہے یا یہاں میوزیم ہمارے ہوٹل کی رعایت سے بنایا گیا ہے۔ بہر حال جس کسی سے بات ہوئی اس نے ہم سے یہی پوچھا۔ تم نے ریخ میوزیم دیکھا کیا؟

آخر ہم نے سوچا، دیکھ ہی ڈالنا چاہیے۔ ہفتہ کی صبح ہماری خالی تھی، جا گھسے۔ معلوم ہوا تصویروں کا میوزیم ہے۔ کچھ مجسمے ہیں اور پرانا کاٹ کباڑ فرنیچر بھی ہے۔ سولہویں صدی کا۔ سترہویں صدی کا۔ ہم تو یہ کرتے ہیں کہ کوئی چیز پرانی ہوئی۔ مثلاً چارپائی ٹوٹنے لگی یا کرسی کا ہتھا اکھڑ گیا تو اسے پھینک دیا یا آگ جلا لی۔ مغربی ملکوں میں ایسا نہیں کرتے۔ پرانی چیزوں کو سینت سینت کر رکھتے ہیں چنانچہ کئی کمرے پرانے فرنیچر سے بھرے ہوئے دیکھے۔ ہمارے گھر میں بھی پندرہ پندرہ بیس بیس سال کے کھٹولے۔ میز۔ ٹرنک، بدھنے، مرتبان، کیلنڈر، چمچے، سرمے دانیاں۔ توشک وغیرہ بھرے پڑے ہیں۔ ہمیں ان کی قدر و قیمت کا خیال نہ آیا۔ اگر ہمارے آنے تک ہمارے گھر والوں نے پھینک نہ دیئے ہوں تو ہم بھی میوزیم بنائیں گے یہ چیزیں تو پھر حال کی ہیں۔ بعض میوزیموں میں تو ہم نے پچیس پچیس، تیس تیس صدی پرانی اور بے کار چیزیں سجی دیکھیں۔

ہم نے کہا۔ ''یہ کچھ نہیں۔ کچھ اور دکھاؤ''

تب ایک گائیڈ نے ہمیں ویلفٹ کی پرانی ٹائلوں کا ذخیرہ دکھایا۔ اس وقت تو ہم نے

www.pakistanipoint.com

تعریف کی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ویسی ہیں جیسی شوکت صدیقی نے اپنے پھاٹک کے ستونوں پر لگا رکھی ہیں، کوئی کمال کی بات نہیں۔

اس کے بعد تصویروں کے کمروں کا نمبر آیا ہم نے سنا تھا کہ ریمبران نامی مصور نے نائٹ واچ، نام کی جو تصویر بنائی تھی اس کی وجہ سے یہ میوزیم دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ریمبران کی بہت سی اور تصویریں بھی اس میوزیم میں بتائی گئیں۔ ایک اور شخص کی بھی جس کا نام ''فان گوگ'' یا ایسا ہی کچھ تھا جس شخص کا نام ایسا عجیب وغریب ہو وہ بھلا کیا تصویریں بنائے گا۔

خیر ہم نے میوزیم کا ٹکٹ خریدا تھا۔ اب تصویریں دیکھنی تھیں۔ ہم نے کراچی آرٹ کونسل میں تصویروں کی کئی نمائشیں دیکھی ہیں اور خود بھی ایک زمانے میں آرٹ سے شغف رہا ہے۔ جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے۔ ماسٹر محمد دین ہماری ڈرائنگ کی کلاس لیا کرتے تھے۔ اور ہم سے سیب، کیلے، گلاس، مرتبان، طوطے اور مور وغیرہ بنوایا کرتے تھے۔ ہمارا ہاتھ ہمارے ہم سبقوں میں سے سب سے زیادہ رواں تھا۔ خود ماسٹر محمد دین بڑے باکمال آرٹسٹ تھے لیکن ہائے بے قدری زمانہ..... ہمیں تو کوئی کیا جانے گا، آج کوئی ان کا نام بھی نہیں جانتا۔ سوائے ان کے شاگردوں کے۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ مارتے بہت تھے۔

اس میوزیم میں کمرے ہی کمرے ہیں۔ سب تصویروں سے بھرے ہوئے بعض

www.pakistanipoint.com

تصویروں کے چوکھٹے بے حد خوبصورت ہیں۔ جی چاہتا تھا کہ چوکھٹا نکال لیں اور اس میں اپنی تصویر لگائیں۔ ایک تصویر میں ایک شخص تلوار لگائے کھڑا تھا۔ پیچھے چاند بھی نکلا ہوا تھا۔ ہم نے کہا، یہ ''نائٹ واچ'' ہے؟ بڑی خوبصورت تصویر ہے''۔

محافظ نے بتایا۔ ''نہیں! یہ نائٹ واچ نہیں ہے۔ وہ تو ریمبران کا شاہکار ہے۔ گیلریوں میں چلتے جاؤ۔ آگے ملے گا۔''

آگے ایک کمرے میں ایک کلاک کی تصویر تھی۔ ہمیں خیال آیا شاید واچ سے مطلب گھڑی ہو۔ ہم نے اس کمرے کے محافظ سے کہا ''یہ تو نہیں ریمبران کی نائٹ واچ؟''

معلوم ہوا۔ ''یہ بھی نہیں ہے، آگے ہے۔''

خیر تصویریں دیکھتے نام پڑھتے، تحسین اور آفرین کے طور پر سر ہلاتے ہم ایک بڑے ہال کمرے میں پہنچے۔ بہت سے لوگ ایک تصویر کے گرد کھڑے تھے۔ کسی نے ہمیں اشارے سے بتایا۔ ''یہ ہے ریمبران کی نائٹ واچ۔''

بہت بڑی تصویر ہے۔ پوری دیوار ڈھانپ رکھی ہے۔ دوسروں کی طرح ہم نے بھی اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، عینک لگا کر دیکھا۔ عینک اتار کر دیکھا۔ اس کمرے میں اس

www.pakistanipoint.com

تصویر کو دیکھنے کے لئے صوفے بھی لگائے گئے ہیں۔ ہم نے بھی ان پر ٹیکی لی۔ اس میں سامنے ایک بادشاہ ہے۔ ہمارے خیال میں تو بادشاہ ہی ہوگا۔ ساتھ ایک ٹوپی والا جرنیل سمجھ لیجئے، ایک شخص بندوق لئے بھی کھڑا ہے۔ تصویر کے دہنے ہاتھ ایک ڈھول والا ہے۔ پیچھے کی جگہ بھرنے کے لئے کچھ اور آدمی بھی دکھائے گئے ہیں۔ کسی کا منہ کسی طرف کو ہے۔ کسی کا کسی طرف کو..... ذرا ٹھہریئے۔ کتاب میں دیکھیں۔ ہم نے میوزیم کی گائیڈ بھی تو خریدی ہے۔ دیکھئے صفحہ 15 اور 16..... ''ریمبران۔ ریمبران..... (1606-1669ء) اپنے زمانے کا بہت بڑا آرٹسٹ تھا (بے شک اپنے زمانے کا ہوگا، ہم نے سوچا) لیڈن کا رہنے والا تھا۔ پھر ایمسٹرڈم چلا آیا اور جب تک مر نہیں گیا۔ وہیں رہا۔ اس کی بنائی ہوئی تصویروں میں یہودی دلہن۔ پطرس ولی کا انکار (.....ارے یہ کیا فضول۔ تفصیلات ہیں، نائٹ واچ کا ذکر آنا چاہیے)..... یہ رہا لکھنے والا لکھتا ہے کہ ریمبران کو غالباً..... (یعنی یقین نہیں ہے اور گائیڈ لکھنے بیٹھ گئے ہیں) اس وقت یہ تصویر بنانے کو کہا گیا تھا جب فرانس کی بیوہ ملکہ میریا ڈی میڈیستی 1639ء میں ایمسٹرڈم آئیں۔ یہ تصویر کپتان فرانز بٹنیگ کوک اور لیفٹیننٹ ولیم فان روٹن برگ کی کمپنی کی ہے۔ لیجئے جن کو ہم نے بادشاہ اور جرنیل سمجھا تھا وہ فقط کپتان اور لیفٹیننٹ وغیرہ نکلے۔ اتنا بڑا آرٹسٹ۔ کسی کرنیل جرنیل کی تصویر بنائی ہوتی تو ایک بات تھی۔ چلئے یہ بھی تحقیق ہو گیا کہ تصویر حسبِ فرمائش بنائی گئی ہے، اپنی مرضی یا شوق سے نہیں ایسا کام تو پھر ٹالا جاتا ہے۔ کتاب بند کر کے ہم نے تصویر پر پھر غور و فکر کیا۔ دیکھا کہ اس میں گہرائی پیدا ہو رہی ہے۔ لوگ زندہ اور جاگتے معلوم ہو رہے ہیں۔ پیچھے تاریک محراب نے سارے منظر کو ابھار دیا ہے۔ کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا۔ گویا بری تصویر نہیں۔ کم از کم ہماری رائے تو یہی ہے۔

نائٹ واچ دیکھ لی۔ نیشنل میوزیم میں کچھ اور شعبے بھی تھے۔ ایک پرنٹ روم۔ ایک ڈول ہاؤس! اب یہ دیکھنے باقی تھے۔ ایک جگہ کچھ چینی جاپانی کتابیں اور خاکے سے پڑے تھے۔ ہم نے محافظوں سے کہا۔ تصویریں تو ہم نے ساری دیکھ لیں۔ یہ پرنٹ روم کہاں

ہے؟ کس طرف کو ہے؟ کدھر ہے؟

بولا۔ ''جناب! یہی تو پرنٹ روم ہے۔''

آگے پھر ایسی واردات ہوئی۔ ہم نے ڈول ہاؤس کا پتہ پوچھا۔ محافظ بولا۔

حضور، آپ اس وقت ڈول ہاؤس میں کھڑے ہیں۔

ہم نے کہا۔ ''باہر جانے کا راستہ کون سا ہے''۔

اس نے ایک طرف کو اشارہ کیا۔ ویسے EXIT لکھا بھی تھا۔ ہم نے صدر دروازے پر اپنا کوٹ لیا۔ چوکیدار کو ٹپ دی اور باہر نکل آئے باہر خوشگوار موسم تھا۔

www.pakistanipoint.com

سوئٹزرلینڈ

6 نومبر تا 11 نومبر 1967ء

www.pakistanipoint.com

ہوٹل ساں ساں ساں

انسان بھی کیسا پکھیرو ہے۔ صبح ہم ایمسٹرڈم میں تھے، اس وقت جنیوا میں ہیں بلکہ دوپہر سے پہلے ہی آن اترے تھے۔ اتوار کا روز ہمیں یہ نوخیز توقع نہ تھی کہ کوئی ہار گلدستے جھنڈیاں اور ڈھول تاشے لے کر ہمارا استقبال کرے گا۔ ان کرنٹوں کو ہماری قدر کیا معلوم۔ تاہم اب تک یہ ہوتا تھا کہ عموماً ہوٹل کی خبر ہوتی تھی۔ یہ معلوم رہتا تھا کہ کل کہاں کس سے جا کے ملنا ہے۔ بعض اوقات یورپ والے پردیسیوں کو طرح طرح سے پریشان کرتے ہیں۔ یعنی ہم فرینکفرٹ میں آ کے اترے ہیں اور دارالحکومت ان لوگوں نے بون بنا رکھا ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں جنیوا اچھی جگہ ہے۔ ہمارے جہاز کو یہیں اترنا ہے لیکن سوئٹزرلینڈ کی حکومت جہاں تک ہمارا خیال ہے برن میں ہے۔ سوایجوکیشن کے انٹرنیشنل بیورو کا نام تو ہمیں معلوم تھا اور یہ کہ ہمیں وہاں جانا ہے لیکن یہ پوچھنا ہم بھول گئے تھے کہ کہاں ہے، کس نگر میں ہے۔ خیر ہم نے سوچا اس وقت تو کہیں ٹھکانہ ڈھونڈو کل صبح معلوم کریں گے۔ برن جانا پڑا تو جائیں گے۔

پس سوِس ایئر کے کونٹر پر بیٹھی کومل نار سے ہم نے کہا کہ قربانت شوم۔ ہمیں کوئی ہوٹل بتا دو۔ مفت کا ہو تو کیا کہنے، ورنہ ہم کرایہ بھی تھوڑا بہت دینے کو تیار ہیں۔ ہو فسٹ کلاس، غسل خانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہوٹل بھی آس پاس چاہئے۔ جہاں ممکن ہو تو ہم اپنا سوٹ کیس خود اٹھا کر لے جا سکیں۔ اس کے علاوہ۔۔۔ اس بی بی نے کہا ''آج تو اتوار ہے۔ آج تو ٹورسٹ دفتر تک بند ہیں جو اس قسم کے انتظام کیا کرتے ہیں۔ میں کیا کر سکتی ہوں''۔

www.pakistanipoint.com

ہم نے کہا ''کچھ نہیں ہوسکتا؟''

بولیں: ''کچھ نہیں۔''

ہم نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور کہا۔ ''تو آج کی شب اسی بنچ پر نہ استراحت کرلیں۔''

گھبرا کر کہنے لگیں۔ ''نہیں نہیں، ٹھہریئے۔ میں کوشش کرتی ہوں۔''

اب اس نے ایک فہرست دیکھی۔ ایک دو جگہ فون کیا اور پھر کہا: ''ہوٹل ساں ساں ساں میں چلے جایئے۔ نکڑ پر ہے''۔

ہم نے کہا۔ ''یہ کیا نام ہوا۔ ہمیں لکھ کر دو۔''

وہ ساں ساں نہیں تھا۔ ہمارے ہی کان ساں ساں کر رہے تھے۔ ساں یر دے تھا انگریزی قاعدے سے سینٹ جرویس ہونا چاہئے۔ جرویس صاحب کوئی سادھو سنت ہوں گے مسیحی مذہب کے۔ ایک نقشے پر اس بی بی نے نشان بھی کر دیا کہ اس سامنے کے چوک کو پار کر کے گرجا ملے گا اور اس گرجا کے بس پیچھے ہے۔

GERVAIS.ST

ہم خوش خوش سوٹ کیس اٹھائے باہر نکلے تو اس چوک کے چاروں طرف گرجا نظر آئے۔ چاروں طرف تو خیر نہیں تین طرف۔ کیونکہ چوتھی طرف سے تو ہم خود آ رہے تھے جو ایئر ٹرمینل بھی تھا اور جنیوا کا بڑا ریلوے اسٹیشن بھی۔ بیٹھ کر نقشے کا مطالعہ شروع کیا۔ کچھ اس کا الٹا سیدھا سمجھ میں نہ آیا۔ خاصی عقل سلیم خرچ کی تو سمجھ میں آیا کہ دہنی طرف کو جانا ہے۔ تھوڑی دیر غور کرنے پر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہمارا دایاں ہاتھ کون سا ہے۔ چنانچہ ادھر کو رواں ہوئے۔ گرجا کے چاروں طرف گھوم گئے۔ کبھی کعبہ مرے پیچھے تھا، کلیسا مرے آگے۔ کبھی کلیسا مرے پیچھے تھا اور۔ خیر۔ آخر تھک گئے۔ اس نام کا ہوٹل نہ ملا۔ ہاں اور ناموں کے ہوٹل ضرور نظر آئے۔ آخر ہم نے سامان باہر رکھا اور ایک ریستوران میں گھس گئے اور بیرے سے کہا: ''ہوٹل ساں ویروے کدھر ہے موسیو۔''

ہم تو خیر فرنچ میں اتنی دستگاہ رکھتے تھے کہ اس شخص کو مسٹر کی بجائے موسیو کہہ کر خطاب کیا لیکن وہ شخص انگریزی سے بالکل ہی کورا نکلا۔ کاندھا جھٹک کر رہ گیا۔ ایک اور شخص ۔

جو بیٹھا چائے پی رہا تھا البتہ ازراہ ہمدردی تین چار منٹ تک بڑی وضاحت سے ہمیں یہ بتایا۔لیکن وضاحت چونکہ بزبان فرانسیسی تھی اس لئے ہم 'مرسی' کہہ کر باہر نکل آئے کہ کسی اور سے پوچھیں گے، یا کسی اور ہوٹل میں چلے جائیں گے۔

اور ہم نے یہی کیا۔ایک ہوٹل میں گھس گئے اور کہا۔کمرہ چاہئے۔سنگل واجبی کرائے کا۔

منیجر نے کہا: واجبی کرائے ہی کا ہے۔52 فرانک روزانہ۔15 فیصد سروس۔اس کے علاوہ ناشتے کے پیسے اسی کرائے میں شامل ہیں الگ نہیں ہوں گے۔

اس آخری پیشکش کا تو ہم نے موزوں الفاظ میں شکریہ ادا کیا لیکن ہمیں جو روزینہ ملتا ہے اس کے حساب سے ہمیں 15 فرانک کا کمرہ چاہئے تھا۔حد سے حد سب چھ ملا کر 20 فرانک کا۔

آخر ہم نے کہا: ''ہوٹل ساں یردے کہاں ہے؟ ہماری وہاں ریزویشن ہو چکی ہے۔ ورنہ ہم ضرور آپ کے ہاں ٹھہرتے۔آئندہ سہی۔''

منیجر اور بیرا دونوں بااخلاق آدمی تھے۔ورنہ بعض ملکوں میں تو ایسے مسافر کو دھکے دے کر باہر نکال دیتے ہیں۔بیرے نے کہا'' وہ سامنے گلی ہے اس میں بائیں ہاتھ کو تیسرا مکان ہوٹل سان یرے ہے! گڈ بائی سر''

ہم نے کہا۔''گڈ بائی''۔اور پھر سوٹ کیس اٹھالیا۔

اب یہ ہوٹل کیسا ہے۔ہم ہوٹلوں کے متعلق لکھتے لکھتے تنگ آ گئے ہیں۔ہمیشہ یہی لگا کہ ہوٹلوں میں سیڑھیوں کے نیچے ڈیوڑھی کے اوپر، کسی کونے کھدرے میں جہاں کوئی گلیارا سا ہوتا ہے اس میں لوگ ایک حجرہ بنا کر اسے ہمارے لئے ریزرو کر دیتے ہیں۔بہر حال ہم اس ہوٹل میں خوش ہیں اور آئندہ بھی ہر ہوٹل میں خوش رہیں گے کیونکہ ایمسٹرڈم میں مسز البرز کے ہوٹل میں چھ راتیں گزار چکے ہیں۔اب ہمیں کہیں تکلیف نہیں ہو سکتی۔

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں وہ مزا نہ رہا

www.pakistanipoint.com

ہوٹل والے نے ہمارا سامان تو رکھ لیا لیکن ابھی گیارہ بجے تھے۔ فرمایا بارہ بجے سے دن شروع ہوتا ہے۔ اس وقت آیئے گا۔ فی الحال باہر کی ٹھنڈی ہوا کھایئے گا۔ ہم نے کہا ''ہاں ہمارا ارادہ بھی فی الحال سیر کا ہے۔ ہمارا کیا ہے۔ ہمارے سامان کو سر چھپانے کی جگہ چاہیے۔''

ہم نے ابھی ابھی پانچ پونڈ کا نوٹ بھنایا تھا۔ ڈٹ کر ایک پونڈ کا کھانا کھایا اس کے بعد مونچھوں..... یا مونچھوں کی جگہ پر تاؤ دیتے ہوئے نقشہ دیکھ کر جھیل کی راہ لی۔

جب ہم آئے ہیں تو موسم ٹھیک تھا۔ لیکن ریستوران سے نکلے تو بارش شروع ہو گئی تھی اور سردی بھی۔ جھیل کے ساتھ ساتھ ہم تھوڑی دور تک تو کچھ بھیگتے اور کچھ بچتے گئے لیکن کنپٹیاں اور کان سُن ہو گئے۔ موسم ہمارے سامنے کیا چیز ہے۔ موسم کی ہم تھوڑا کئے پروا نہیں کرتے جہاں ہمارے دشمنوں کا بال بیکا ہوا۔ ہم نے ڈاکٹر محمد سرور کو فون کیا لیکن یاد آیا کہ یہ تو کراچی نہیں۔ جنیوا ہے میاں۔ ڈاکٹر آیا بھی تو فیس مانگے گا اور فیس تم نے منہ مانگی نہ دی تو تمہارا یہ سوٹ کیس اٹھا کر لے جائے گا۔ ٹاپتے رہ جاؤ گے۔ پس چلو واپس ہوٹل۔ بارہ بھی بج رہے تھے اس وقت تو ہم آ گئے اور ٹھر ٹھر کرتے سو گئے۔ شام کو پھر نکلے۔ جنیوا کے اردگرد پہاڑ والی برف پوش چوٹیاں ہم نے جہاز ہی سے دیکھ لی تھیں اور جھیل بھی۔ اصل میں ہمارے اب یہاں اترنے کی حاجت نہ رہی تھی کیونکہ لوگ یہی چیزیں دیکھنے یہاں آتے ہیں۔

بازار میں شیشوں کے پیچھے گھڑیوں کے ڈھیر کے ڈھیر نظر آئے۔ ہر شکل صورت کی گھڑیاں۔ ہر قیمت کی گھڑیاں۔ سو گھڑیوں کے تاجروں کو تو یہاں ضرور آنا چاہیے لیکن باقی لوگ کیوں آتے ہیں یہ ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ ایمسٹرڈم میں موسیو فان لیئر نے کہا۔ میں تو ہمیشہ بھری سردیوں میں سوئٹزرلینڈ جاتا ہوں اور اپنی چھٹی وہاں گزارتا ہوں۔ ہم نے کہا سردیوں میں تو وہاں سردی ہوتی ہوگی بلکہ برف بھی۔ بولے برف ہی کی خاطر تو جاتا ہوں۔ عجیب لوگ ہیں برف دیکھنے اتنی دور آتے ہیں۔ کیا ان لوگوں کے گھروں میں ریفریجریٹر نہیں ہیں۔ ہم نے یہاں کی برف دیکھ لی ہے۔ اب سوئٹزرلینڈ کی یاد آیا کرے گی تو اپنے فریج کا اوپر کا خانہ کھول کر دیکھ لیا کریں گے۔ اب رہا برف پر پھسلنے کا شوق۔ سو ہر شوق کی

ایک عمر ہوتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ہم بھی جس چیز کو، جس صورت کو دیکھتے تھے اس پر پھسل پڑتے تھے۔ اب وہ بات نہیں آج ہی شام جنیوا کی جھیل کو بھی چل پھر کر بنظر غائر ہم نے دیکھ لیا۔ اس میں ہمیں پانی تو نظر آیا اور کوئی خاص بات دکھائی نہ دی۔ سوئٹزرلینڈ اور اس کے پہاڑ اور اس کی جھیلیں اور اُن کی خوبصورتی۔ قارئین کرام۔ یقین کیجئے سب پراپیگنڈا ہے پراپیگنڈا۔

www.pakistanipoint.com

کھولنا اکاؤنٹ سوئٹزرلینڈ میں

اے لوگو! اے وہ تمام لوگو جن سے ہم صمیم قلب سے وعدے کر کے چلے تھے کہ تمہارے لئے کیمرہ لائیں گے، تمہارے لئے گھڑی لائیں گے۔ تمہارے لیے ٹیپ ریکارڈر لائیں گے۔ سب کچھ بھول جاؤ اور ولایت کے پتے پر ہمیں خط لکھ دو کہ تم نے ہمیں معاف کر دیا۔ بخش دیا۔ ہم تم کو منہ نہیں دکھا سکتے۔

سچ یہ ہے کہ ہم نے تو اپنی طرف سے جز رسی کی بہت کوشش کی لیکن قدرت ہی کو ہماری خجالت منظور ہے۔ کل کی لیجئے۔ ہم نے کمرے میں بند ہو کر بسکٹ کھا لئے اور پانی پی لی اور اوپر سے نمک سلیمانی پھانک لیا۔ کیونکہ ویسے یہ خوراک نقصان کرتی ہے۔ اندر جا کر پھول جاتی ہے۔ شام کو البتہ پیٹ نے کہ بڑا بدکار ہے کھانا مانگا۔ کھانے کے معاملے میں ہم نے مدت سے ترکِ حیوانات کر رکھا ہے۔ بیف یعنی بڑا گوشت ہم سے کھایا نہیں جاتا۔ برلن میں ایک روز بیف اسٹیک لے لیا تھا۔ کھانے اور پچانے کی منزل ہی نہیں آئی۔ ہماری چھری سے کٹا تک نہیں۔ ہمارا خیال ہے اصلی بیف نہیں تھا۔ نائیلون وغیرہ کا بنا ہوا تھا۔ خیر ہم نے چوم کر چھوڑ دیا۔ اور اِدھر اُدھر سے آلو کھا لئے۔ لندن میں ہم لیمب یعنی بھیڑ کے بچے کا گوشت رغبت سے کھاتے تھے۔ حلال حرام کی بحث اخبار میں چھڑی تو اس سے بھی گئے۔ معرّی کے متعلق ہم نے اور علامہ اقبال نے سنا تھا۔ کہ گوشت نہ کھاتا تھا۔ پھل پھول پر گزر اوقات کرتا تھا۔ ایک روز کسی نے اسے بھونا ہوا تیتر بھیجا تو بجائے اس کے کہ چپکے سے

کھا لیتا، فلسفہ چھانٹنا شروع کر دیا کہ جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات ہے۔ ہمارے معز بننے کی راہ میں کئی چیزیں حائل رہیں۔ پھل پھول بھی یہاں کچھ سستے نہیں ہیں اور کوئی شخص محبت سے ہمیں بھونا ہوا تیتر بھیجے تو ہم سے انکار نہیں ہو سکتا۔ انکار کیا معنی، یہاں ہم کوئی چیز کھاتے ہیں تو وہ تیتر کا ہم نسل، مرغ ہی ہے۔ بھنا ہوا مرغ، بلکہ بھنے ہوئے مرغ کی ایک ٹانگ۔ سو کبھی یہ پانچ روپے کی آتی ہے کبھی سات روپے کی۔ بون میں ہرٹی کے ڈپارٹمنٹل اسٹور سے تو ایک بار ڈھائی مارک کی بھی مل گئی تھی، لیکن پھر اس کا نرخ بالا ہی ہوتا گیا۔ جنیوا آ کر پہلے روز ہم نے ساڑھے پانچ فرانک یعنی ساڑھے پانچ روپے کی لی۔ دوسرے روز ایک جگہ ساڑھے چھ کی ملی۔

لیکن ذکر ہم کل کا کر رہے تھے کہ شام کو پیٹ نے ہمیں مجبور کیا کہ کھول بٹوا۔ کھلا ہمیں کھانا۔ ہم نے پچکارا کہ میاں ٹھہر۔ کوئی ہوٹل دیکھتے ہیں جس میں عام قسم کے آدمی بیٹھے ہوں۔ کیا کھائے گا؟ سینڈوچ کھلائیں؟ پنیر کے سینڈوچ بڑے اچھے ہوتے ہیں۔ لیکن پیٹ کی وہی رٹ۔ مرغ کی ایک ٹانگ۔

آخر ہم جی کڑا کر کے ایک ریستوران میں گھس گئے اور کہا ''کھانا کھائیں گے ہم'' بیرا بہت مودب اور قاعدے کا تھا۔ ایک کمرے میں ہمیں لے گیا اور بولا ''کیا پئیں گے''

ہم نے کہا ''کچھ نہیں۔ ہم مسلمان ہیں''۔

''سُوپ، کیا لاؤں۔''

ہم نے کہا۔ ''سُوپ ووپ نہیں چاہیے۔ ہمارے ہاں اس کا رواج نہیں''۔ ''کوئی اشتہا افزا چیز حاضر کروں''۔

ہم نے پھر کہا۔ ''کچھ نہیں، ہمارا پہلے ہی بھوک سے دم نکلا جا رہا ہے اور ہاں شکر ہمیں منع ہے۔ لہٰذا بعد میں میٹھا لانے کی بھی کوشش نہ کرنا۔ ہاں کافی پی لیں گے۔''

''تو پھر کھائیں گے کیا آپ؟''

www.pakistanipoint.com

''مرغ کی ایک ٹانگ''

بیرے نے بس ایک چھری کانٹا ہماری میز پر رہنے دیا باقی سارے اٹھا لئے۔ تھوڑی دیر بعد آیا۔ ایک چولہا قسم کی چیز لایا جس کے اندر موم بتی جل رہی تھی۔ زیادہ تکلف کے ہوٹل میں کھانا گرم رکھنے کے لئے اسی قسم کے چونچلے ہوتے ہیں۔ اب ہمارا ماتھا ٹھنکا۔

وہ تو اندر گیا۔ ہم نے بٹوا نکال کر رقم گنی۔ خاصے روپے تھے۔ اطمینان ہو گیا۔ پہلے وہ پانی کا پیالہ لایا جس میں لیموں کی قاش پڑی تھی۔

ہم نے اسے ایک طرف کھسکا دیا۔

پھر وہ سلاد کا پیالا لایا۔ ہم نے اسے سونگھا۔ شاید زیتون کا تیل یا ایسی ہی کوئی چیز سلاد میں تھی۔ ہم نے اسے بھی پرے کھسکا دیا۔

آخر میں وہ جرم ضعیفی کی سزا۔ یعنی مرغ کا پارچہ لایا۔ پلیٹ کو چولہے پر رکھا اس پارچے میں سے آدھا نہایت ادب سے کاٹا اور ہماری پلیٹ میں رکھا۔

ہم نے کہا 'مرسی' یعنی شکریہ۔ اب جاؤ۔ ہم خود ہی کھا لیں گے۔

کھانا کھایا۔ اور کافی پی، بل آیا ساڑھے بارہ فرانک کا۔ اس پر 15 فیصد سروس چارج۔ سوا چودہ سے کچھ زیادہ۔ اب کیا پون فرانک ٹپ بھی نہ دیتے۔

ہم نے بڑی بے اعتنائی سے پندرہ فرانک اس کے حوالے کئے۔ کوٹ سنبھالا اور باہر.....

لندن میں پھرا چھا تھا۔ مسز واٹسن کے بھٹیار خانے میں رہ کر ہم نے کچھ پونڈ بچا لئے تھے جو جرمنی میں خرچ ہوئے۔ جنیوا میں ایک صاحب وطن عزیز کے مل گئے۔ ہماری ہی طرح کام کے بہانے دھپل میں یورپ کی سیر کر رہے تھے۔ کفایت شعاری کی خوبیوں پر بات چھڑ گئی۔ ہم نے بھی اسراف کرنے والوں کی جی کھول کر برائی کی اور کہا۔ دیکھئے لندن

میں ہم نے اپنے وظیفے میں سے بچا کر یہ سوٹ خریدا ہے کیسا ہے؟ وہ کچھ متاثر نہ ہوئے۔

اب ہم نے کہا یہ ''اوورکوٹ بھی ہم نے اپنی بچت میں سے لیا ہے۔ دس پونڈ کا آیا تھا۔''

ان پر پھر بھی کچھ خاص اثر نہ ہوا۔ ہم نے نائیلون کی دو قمیضیں، جرابوں کے جوڑے اور متعدد ٹائیاں خریدی تھیں۔ وہ بھی دکھائیں کیونکہ ہم اس وقت داد طلبی کے موڈ میں تھے۔

اس کا کما حقہ، ردعمل نہ ہوا تو ہم نے سوٹ کیس کھول کر چینی مٹی کی نیلی پلیٹ نکالی اور کہا ''ڈلفٹ کی ہے، اور یہ دیکھو اس پر پون چکی بھی بنی ہوئی ہے۔''

بڑی مشکل سے بولے ''ہاں ٹھیک ہے''

اب ہم نے انہی پون چکی کا ایک اور نمونہ دکھایا۔ یہ بھی ہم نے لیڈن سے بڑے چاؤ سے خریدا تھا۔ آرٹ کا البم۔ پرانی تصویروں کے کچھ پرنٹ۔ پچھلی صدی کے کچھ میگزین اور شاعری کی کچھ کتابیں بھی دکھائیں۔ یہ سب ہم نے انگلستان اور فرانس اور جرمنی سے فراہم کی تھیں۔

بولے ''کیمرہ کونسا لیا ہے؟''

ہم نے کہا۔ ''ہمیں کیمرے وغیرہ پسند نہیں۔ مصوری اور تصویر کشی وغیرہ ہمارے شوق نہیں ہیں۔ ماہ رخوں کے لئے ہم نے شاعری سیکھ لی ہے۔ اسی سے کام نکل آتا ہے۔''

''ٹیپ ریکارڈ؟ ٹیلی ویژن؟ ٹرانزسٹر؟''

ہم نے انہیں بتایا کہ گانے بجانے کے آلات بھی ہمارے دائرے سے خارج ہیں۔ 1949ء میں ہم نے ایک سیکنڈ ہینڈ مرفی ریڈیو لیا تھا۔ بڑی خوش اسلوبی سے کام دے رہا ہے۔

اس پر وہ اپنے کمرے میں لے گئے۔ بولے: ''ٹیلی ویژن سیٹ تو میں نے بک کرا دیا

''اور یہ کیا ہے؟'' ہم نے کہا

بولے ''یہ الیکٹرک ٹوسٹر ہے!''

ہم نے کہا ''الیکٹرک ٹوسٹر کی بات نہیں۔ اس کے پاس جو ہے؟''

بولے۔ ''پریشر ککر ہے۔ کبھی دیکھا نہیں تم نے؟''

ہم نے کہا ''ان چیزوں کی بجائے تم فریج لے لیتے تو اچھا تھا۔ گرمیوں میں کام آتا ہے۔ پانی ٹھنڈا رہتا ہے۔''

بولے ''ہاں لیا ہے وہ کمپنی نے سیدھا بھجوا دیا ہے۔''

''اور کیا لیا ہے؟'' اب ہمارا مورال کچھ گرنے لگا تھا۔

بولے ''بس اور کچھ نہیں لیا۔ ہاں فیٹ کار کے پیسے لندن میں جمع کرا دیئے ہیں۔ اٹلی سے جہاز میں بار ہو گی۔''

ہم نے کہا تم نے پون چکی کے نمونے نہیں خریدے کیا؟ ہالینڈ کی خاص چیز ہے۔

بولے ''فلپس کا کارخانہ بھی تو ہالینڈ ہی میں ہے۔ نیچے جو ڈبہ رکھا ہے اس میں فلپس کا ٹرانزسٹر ہے''۔

تب ہم نے پوچھا۔ ''کھاتے کیا تھے آپ؟

بولے: ''ڈبل روٹی کھاتا تھا۔ ایک ڈبل روٹی، ایک ڈبہ پنیر کا، مجھ اکیلی جان کے لئے دو تین دن کو کافی تھا''۔

''رہتے تو ہوٹل میں ہو گے؟''

بولے۔ ''یہ کمرہ الگ لینے کی عیاشی نہیں کرتا تھا۔ لندن کے مضافات میں ایک کمرہ لے کر ہم تین آدمی رہتے تھے۔ اپنی اپنی چارپائی کے پیسے دیتے تھے۔ اب یہاں ایمسٹر ڈم میں سنگل کمرہ لینا پڑا ہے۔ کہو تو تمہارے ساتھ آ جاؤں۔ آدھا، آدھا دونوں دے دیں

www.pakistanipoint.com

www.pakistanipoint.com

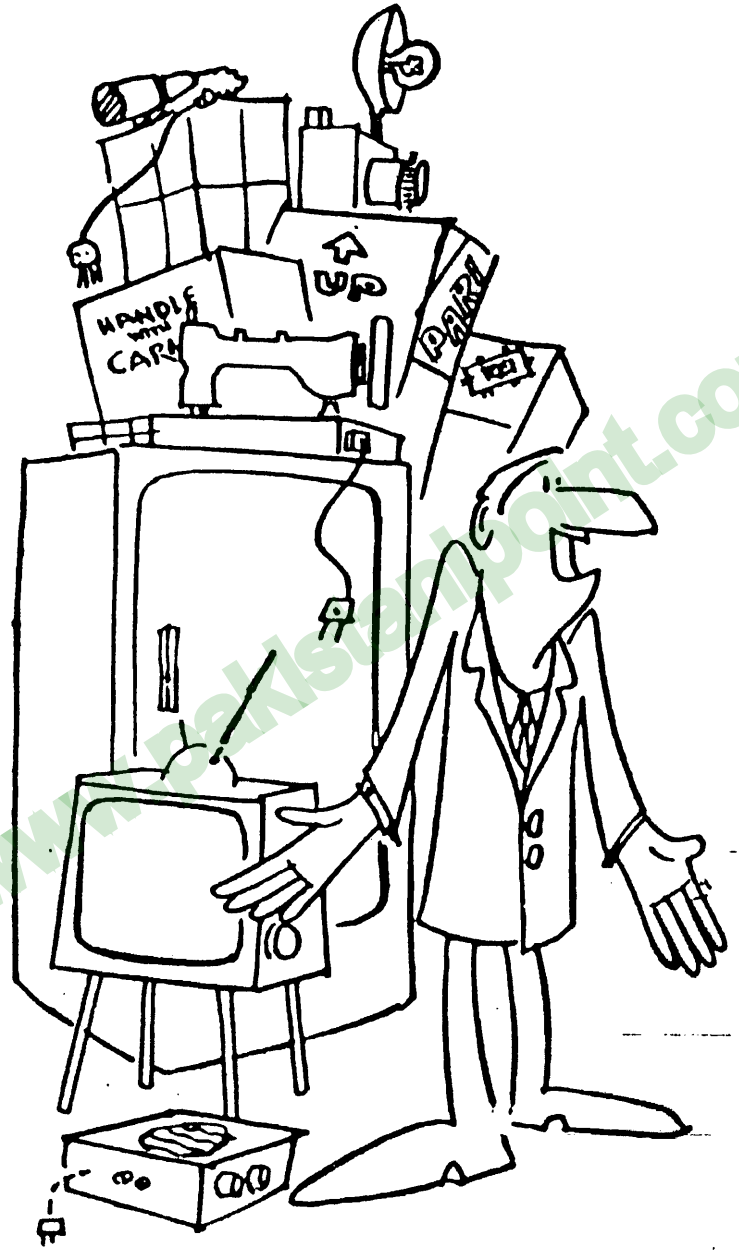

www.pakistanipoint.com

گے۔"

ہم نے غور کر کے کہا۔ "تمہیں تکلیف ہوگی۔ کیونکہ ہم رات کو خراٹے لیتے ہیں۔ ورنہ انکار نہیں تھا۔"

اب ہم نے عزم بالجزم کیا کہ گزشتہ راصلوات۔ اب ہم بھی کفایت کریں گے۔ جنیوا آنے پر ہمیں جو گزارہ ملا اس میں سے ہم نے سوفرانک پہلے ہی دن سوئٹزر لینڈ کے ایک مشہور بنک میں جمع کرا دیئے۔ اور طے کیا کہ ان کو ہم اب نہیں نکالیں گے۔

سوئٹزر لینڈ کے بنک دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ہزاروں لاکھوں روپے کے کاروبار کرتے ہیں۔ راز داری ان کا اصول ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے حکمران اور سیاستدان اور ملک التجا ان بنکوں میں پیسے جمع کرا دیتے ہیں کہ کل کلاں تخت کا تختہ ہوا تو سوئٹزر لینڈ میں جا رہیں گے یا اس جمع جتھا کے بل پر کہیں اور بیٹھ کے عیش کریں گے۔ اور بقیہ عمر یاد خدا میں گزاریں گے۔

ہم نے بھی یہ پیسے جمع کراتے وقت خزانچی سے کہہ دیا کہ میاں اس رقم کا کسی کو کانوں کان پتہ نہ چلے۔ ہمارے ملک کا قانون بہت سخت ہے کوئی شخص باہر روپیہ نہیں رکھ سکتا۔

اس نے کہا۔ "اطمینان رکھئے۔ ہم کسی کو نہیں بتاتے۔ آپ کے ملک کے اور بھی بہت سے رؤسا اور سیاست دان اور سابق وزیروں کے اکاؤنٹ تنٹ ہمارے یہاں ہیں۔ بعضے تو سودے کر کے اپنا کمیشن سیدھا جمع کرا دیتے ہیں"۔

ہم نے کہا۔ تم لوگوں کا اصول راز داری ہے اس لئے سب کے نام تو نہیں پوچھتے۔ چند ایک کے بتا دو۔ ہم اپنے کالم میں تو شاید لکھ دیں۔ ویسے کسی کو نہیں بتائیں گے۔"

لیکن وہ شخص تیار نہ ہوا۔ اصل میں ہم بڑی ہوشیاری اور ترکیب سے اس کا امتحان کر رہے تھے۔ کسی کا نام وہ ہمیں بتا دیتا تو اس کا امکان تھا کہ ہمارا بھی کسی کو بتا دیتا۔

www.pakistanipoint.com

اور یوں سوئٹزرلینڈ کے سب سے بڑے اور بااعتماد بینک میں ہمارا اکاؤنٹ کھل گیا۔ ہم نے خفیہ اکاؤنٹ نمبر بھی لے لیا اور حساب کرنا شروع کیا کہ خاصی شرح سود ہے۔ دس سال میں ہماری رقم دگنی ہو جائے گی۔ یعنی دو سو فرانک اور پچاس سال میں تو یہ کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی۔ ہم نے حساب پھیلانا چاہا لیکن ہم سے نہ ہوا۔ اتنا بڑا حساب تو کمپیوٹر ہی کر سکتا ہے۔

افسوس کہ یہ پھول دو دن بہار جانفزا دکھا کر مرجھا گئے۔ آج صبح ہم نے یہ پیسے نکلوا لئے۔ بس کچھ ایسی ہی بات تھی۔ ہوٹل کا بل دینا پڑ گیا۔

اس کے علاوہ حتی الوسع اپنے ملک کے قانون کی خلاف ورزی کرنا بھی ہمیں پسند نہیں۔

www.pakistanipoint.com

ہم جنیوا سے چل دیے

اگر ہم جنیوا سے برن نہ آتے، جیسا کہ پروگرام نہیں تھا۔ ہمارے پاس ہوائی جہاز کا ٹکٹ جنیوا تا زیورخ موجود ہے تو سوئٹزرلینڈ کے متعلق ہماری رائے اسی قسم کی رہتی جیسی مخدومنا حفیظ جالندھری نے ایک نظم میں جنت کے متعلق ظاہر کی ہے کہ:

کیا ہے جنت، چند حوریں، ایک چمن دو ندیاں

ہم نے ایک بار کہا بھی کہ آپ نے محض اس لئے کہ آپ کو وہاں نہیں جانا برائی کر دی ہے۔ ورنہ ہمارے خیال میں تو اچھی خاصی جگہ ہے جنت ہمیں کوئی بھیجے گا نہیں ورنہ ہمیں تو کوئی اعتراض نہ ہو۔ فرمانے لگے کیا پتہ میاں۔ وہاں جانا ہی پڑ جائے۔ آدمی کوئی ہمارا دم تحریر تو ہوتا نہیں، کراماً کاتبین اپنے روزنامچوں میں جو جی چاہے لکھ دیں، جو جی چاہے حذف کر دیں۔

جنیوا میں کسی نے مشورہ دیا کہ حضرت! ہوائی جہاز سے سوئٹزرلینڈ نہیں دیکھا جاتا اور پھر جتنی دیر میں تمہاری بس ہوائی اڈے تک پہنچے گی یا ہوائی اڈے سے دوسرے شہر کے ٹرمینل تک پہنچائے گی۔ اتنی دیر میں تمام سوئٹزرلینڈ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاؤ گے۔ اور پھر برن نہ دیکھا تو کچھ بھی نہ دیکھا۔ ہم نے کہا اچھی بات ہے۔

ہم نے ہوٹل ساں ساں ساں کو خیر باد کہی اور پون بجے کی ایکسپریس پر آن سوار ہوئے۔ شہر سے نکلتے ہی منظر بدل گیا۔ داہنے ہاتھ جھیل کبھی چھپ جاتی تھی کبھی دکھائی دے جاتی تھی۔ بائیں طرف چراگاہوں اور سبزہ زاروں کے سلسلے شروع ہو گئے اور ان میں

فاصلے فاصلے سے خوبصورت چھوٹے چھوٹے پرانی وضع کے کاٹیج۔ پھر لوزان آیا۔ یہ بھی خوبصورت شہر ہے لیکن ہمیں تو گاڑی میں بیٹھے بیٹھے کچھ جچا نہیں اس کا وہ چہرہ جو ہماری طرف کو تھا بس یورپ کے دوسرے شہروں کی طرح تھا۔ ماڈرن عمارتیں، اشتہاروں کی ریل پیل، ٹریفک کا زور۔ لیکن ان سے گزرے تو وہی سرسبزی و شادابی، کبھی گھاٹی، کبھی وادی، کبھی جنگل۔ مغرب میں گھاٹی کی دیوار ہے تو مشرق میں نشیب کا سلسلہ دور جھیل کے پانیوں تک چلا گیا ہے اور اس درمیان میں گاؤں ہیں، کھیت ہیں۔ مویشیوں کے ریوڑ ہیں۔ موسم کچھ گدلا تھا لیکن کھلی دھوپ ہوتی تو منظر کی شادابی شاید ایسی نہ رہتی۔ خدا جانے کون لوگ ہوں گے جو ان سبزہ زاروں میں رہتے ہوں گے اور پھر ہمیں صحراؤں کا خیال آیا۔ عرب کے صحرا کا۔ افریقہ کے صحرا کا۔ اپنے صحرا کا جہاں آدمی پانی کے قطرے اور گھاس کی پتی کو ترستا ہے اور وہ جگہیں اسی دنیا میں واقع ہیں اور وہ لوگ انہی صحراؤں میں زندگی کے کڑے کوس طے کرتے سوئٹزرلینڈ دیکھے بغیر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہاں کی گائیں اور دوسرے مویشی بھی موٹے مسٹنڈے نظر آئے۔ ہمارے مویشیوں کی طرح بھوکے ننگے نہیں۔ اب ہمارا خیال بھٹکتا ہوا گودان کی طرف گیا۔ پریم چند کی طرف گیا۔ پریم چند کی جنم بھوم کی طرف گیا۔ جہاں کال کے بادل ایک بار پھر منڈلا رہے ہیں۔ ہم جھرجھری لے کر ایک بار پھر سوئٹزرلینڈ میں آ گئے۔ اے آنکھو، یہ سب دیکھ لو۔ جانے پھر کب آنا ہو۔ کبھی آنا ہو کہ نہ ہو۔ پھر سحر ہو نہ ہو کسے معلوم؟ اور جب ہماری آنکھیں اس حسن اور سبزے کے نظارے سے لبالب بھر گئیں اور چھلک گئیں تو اپنے دوست محبوب خزاں کا مصرع بار بار زبان پر آیا۔ اتنا حسن کیا کرو گے؟ اتنا حسن کیا کرو گے؟

برن سے پہلے گاڑی کچھ دیر کو فرائی برگ کے اسٹیشن پر رکی۔ عین لائین کنارے ایک قبرستان تھا۔ دور دور تک قبروں اور صلیبوں کا سلسلہ لیکن سب پھولوں سے ڈھنپی ہوئی۔ سبزہ نورستہ ان ابدی آرام گاہوں کی نگہبانی کرتا ہوا۔ قلم کی کیا مجال جو اس حسن کے سحر جلال کو احاطے میں لائے۔

برن میں ہوٹل میٹرو پول پہنچ کر ہم نے کونٹر پر کہا۔ ''جلدی سے ہمیں کمرہ دیجئے پھر ہمیں سیر کو نکلنا ہے۔''

کونٹر پر ایک لڑکی تھی۔ بولی: آپ مسٹر سلنگا ہیں۔

ہم نے کہا ''نہیں۔ ہم مسٹر سلنگا نہیں ہیں۔ مسٹر انشا ہیں۔'' جنیوا سے انٹرنیشنل بیورو آف ایجوکیشن نے فون کر کے ہمارے لئے کمرہ ریزرو کروایا تھا۔ پس اب دیر مت کرو۔''

''مسٹر سوتے نے فون کیا تھا۔''

ہم نے کہا: ''مسٹر سوتے کو ہم نہیں جانتے، نہ مسٹر جاگتے کو جانتے ہیں۔ وہاں تو مس کارڈیل تھیں۔ ہوسکتا ہے ان کے دفتر میں مسٹر سوتے کوئی صاحب ہوں۔

بولیں۔ ''اگر آپ مسٹر سلنگا ہیں اور مسٹر سوتے کے فرستادہ ہیں تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ کمرہ حاضر ہے۔''

''ورنہ۔۔۔!''

''ورنہ نہیں۔ ہمارے پاس ایک ہی سنگل کمرہ ہے۔''

پہلے تو جی میں آئی کہہ دیں کہ ہاں ہمیں مسٹر سلنگا ہیں۔ سلنگا ہماری عرفیت ہے لیکن سچ مچ کے مسٹر سلنگا آ گئے تو ناحق فضیحتہ ہوگا۔ ہم نے کہا۔ ہم نہیں جانتے آپ جنیوا فون کیجئے۔ یہ نمبر ہے ان سے تصدیق کیجئے۔ جنہوں نے کمرہ ریزرو کروایا تھا۔ انہوں نے فون کیا اور فون کرتی رہیں۔ پہلے نہ جانے کون فون پر آیا پھر کوئی اور آیا۔ پھر کسی اور کو بھیجا۔ آخر کھلا کہ وہ لوگ ہماری ریزرویشن کرانے کا ارادہ تو رکھتے تھے لیکن بس بھول گئے۔

ہم نے کہا۔ ''خیر! بندہ بشر ہے۔ لیکن ہمیں کمرہ چاہیے''

بولیں: ''ڈبل روم ہے۔ سنگل تو ہے نہیں''۔۔

ہم نے کہا: ٹھیک ہے۔ ڈبل روم ہی دیجئے۔ ہوٹل ایسا پُر رعب اور شان و شوکت والا ہے کہ ہم نے بھاؤ تاؤ نہیں کیا۔ آج کی رات تو سوئیں گے۔ مزے کریں گے۔ کل بل

www.pakistanipoint.com

دیتے وقت دیکھا جائے گا۔ اصل میں ہم البزر ہوٹل اور ساں ساں سال ہوٹل قسم کے ٹھکانوں میں رہتے تنگ آ گئے ہیں۔ اب یہ اتنا کشادہ کمرہ ہے جس میں ہم پلنگ پر آلتی پالتی مارے بیٹھے لکھ رہے ہیں۔ ہوٹل ساں ساں میں تو رات کو جونہی دامانِ خیال یار کو پکڑنے کے لئے کروٹ بدلی، زمین پر آ رہے۔ ہم نے خود ہی بیورو والوں سے کہا تھا کہ اب کے ہمارے لئے کوئی فسٹ کلاس ہوٹل مقرر کیجئے گا۔

بولے۔ ''میٹرو پول اچھا ہے لیکن مہنگا ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''آپ کیا سمجھتے ہیں۔ ہم کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ للہ ہمارے سٹیٹس کا خیال کرو۔''

فرمایا ''تو ہلٹن وغیرہ میں آپ کے لئے کمرہ مع غسل خانہ ریزرو کرا دیں۔''

اب ہم کچھ ڈر گئے۔ ہم نے کہا۔ ہلٹن وغیرہ سے ہمیں وحشت ہوتی ہے شور بہت رہتا ہے اور غسل خانہ کی حاجت نہیں۔ آج کل سردیاں ہیں ہمیں حکیم نے نہانے سے منع کر رکھا ہے اور فسٹ کلاس کا مطلب ہے ہمارے حساب سے فسٹ کلاس۔''

اس پر ان لوگوں نے میٹرو پول کر دیا۔ یعنی کرنے کا وعدہ کیا۔ ہم نے سوچا تھا کہ سنگل روم ہوگا۔ آخر کہاں تک مہنگا ہوگا۔ ڈبل روم کی ہم نے سوچی ہی نہ تھی۔ لیکن ہمارے ساتھ پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔ ایسے موقع پر ہم آدھی رات تک ایک بستر پر سوتے ہیں۔ باقی رات دوسرے پر لوٹ لگاتے ہیں۔ ناشتہ غالباً ایک ہی ملے گا۔ کم ہوا تو اپنے غیر حاضر پارٹنر کا بھی منگا کر کھائیں گے۔ کیوں کہ ہوٹل ساں ساں والوں نے تو کمال ہی کر دیا۔ بس ایک چھوٹی سی پاپا نما روٹی دیتے تھے۔ مکھن بھی بقدر اشک بلبل، ذرا سا مارملیڈ۔ اب ہمیں مسٹر واٹسن یاد آئیں کہ دو انڈے دیتی تھیں۔ بے شمار توسوں اور مکھن مربے کے علاوہ کارن فلیک اور دودھ بھی۔ پھلوں کے رس کا گلاس بھی۔ وہاں سے گرے تو جرمنی میں باقی ٹھیک ہے ہاں انڈا اپنے پلے سے کھایا۔ ایمسٹرڈم میں مکھن اور پنیر اور قسما قسم کی میٹھی پھیکی مسالے دار روٹیوں کا ڈھیر۔ جنیوا میں کئی بار جی چاہا کہ ساتھ والے کی پلیٹ سے نظر بچا کر

www.pakistanipoint.com

روٹی اٹھالیں۔

کسی شہر سے رخصت کی شب ہمیشہ ہم پر بڑا اثر چھوڑتی ہے۔ ایمسٹرڈم سے ہمیں علی الصباح چلنا تھا اور چھ بجے اٹھنا تھا۔ رات بھر بارش ہوتی رہی پانچ بجے سامنے سڑک پر گانے کی آواز آئی۔ تین لڑکے اور دو لڑکیاں چھتریاں تانے ایک مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھی الاپ کر رہی تھیں I LOVE TO KISS YOU آواز میں اُبلتی ہوئی جوانی اور بے فکری جانے کون لوگ ہوں گے کہاں کے ہوں گے۔ پھر وہ ناچنے لگے۔ ہم نے اپنا دریچہ کھولا۔ مدھم روشنی کی تو وہ لوگ متوجہ ہوئے۔ اے مسافر کہاں کے رہنے والو ہو تم۔ ہم نے جی میں تو کہا کہ تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں۔ لیکن یوں خاموش رہے۔ اب وہ بولے کونسی زبان بولتے ہو۔ اب پھر ہم نے اپنے آپ سے کہا کہ دل کی زبان بولتے ہیں اور سمجھتے ہیں اور جی چاہتا ہے کہ تم سے آن ملیں۔ کیوں نہیں تم لوگ یہاں آجاتے، اس گرم بستر میں آرام کرتے، اس بے خانمانی سے چھٹکارا پاتے۔ کوئی جواب نہ پا کر ان لوگوں نے اپنی حُدی کو تیز تیز اور اپنی نوا کو بلند تر کر دیا۔ دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں۔ اے بیقرار روحو! ہم تمہارے ہیں، تمہارے ساتھ ہیں۔ اب ہم نے دریچہ بند کر لیا کمرے کا بھی، دل کا بھی، آنکھوں کا بھی۔ جانے کب وہ لوگ برستے پانی میں کہاں رخصت ہو گئے۔ دوبارہ آنکھ کھولی تو سناٹا تھا۔

جنیوا کی آخری رات ہم نے دریا پار سنہری کلسوں والے روسی گرجے کا چکر کاٹ کر یونیورسٹی کے باغ میں سے ہوتے ہوئے نئے چوک سے پرومی نیڈ ڈی لاترلی کی سیرگاہ میں ٹھیکی لی۔ گھاٹی چڑھ کر ان ٹیڑھی میڑھی تنگ و نیم تاریک جگہوں میں گم ہو گئے۔ جن میں اب بھی سولہویں اور سترہویں صدی کی بو باس تھی۔ سب سے پہلے کوچہ تیراسے آیا۔ وہ حویلی جس میں 1800ء میں نپولین اعظم مادام ساسیوں کے ہاں مہمان اترا تھا۔ یہ چند گز کا کوچہ آگے ایک اور ایسے ہی تنگ کوچہ میں مل گیا۔ دہنے ہاتھ چڑھائی تھی اور یہی گرانڈ روتھی۔ 25 کے مکان کے سامنے جا کر ہم رک گئے یہاں ملٹن اٹلی سے واپسی پر یا سچیو ردیو

دارتی سے آ کے ملا تھا۔ اور آگے تھوڑی دور چل کر دہنے ہاتھ کا یہ اونچا مکان دیکھئے نمبر 40۔ یہاں 1772ء میں روسو پیدا ہوا تھا۔ اب لوٹیے اور نشیب کی طرف آیئے جہاں گرانڈ روختم ہوتی ہے۔ رودی لا سیتے شروع ہوتی ہے۔ نمبر 20 پر یہ اونچی حویلی دیکھ رہے ہیں آپ؟ کبھی یہ شاتو بریاں کی قیام گاہ تھی۔ اچھا اے رفتگاں کی روحو۔ اس مسافر کا سلام لیکن جاتے ہوئے ایک نظر اور ولی پطرس کے کیتھڈرل پر، اس کی پہلی اینٹ 1150ء میں رکھی گئی تھی۔ عمارتیں کھڑی ہیں۔ ان جگہوں میں پیدا ہونے والے جوان ہونے والے۔ گھومنے والے ہی نہیں رہے، ہر چیز کو دوام ہے سوائے انسان کے۔ در و دیوار موجود، ان کے بنانے والے مٹی ہو چکے۔ اب چل اے سیلانی دریا پار کر اور کل کے لئے رخت سفر درست کر۔

www.pakistanipoint.com

برن کی جنگرن گاسے

www.pakistanipoint.com

برن کی سحر بھری رات

ہم نے پیرس کے گرجوں اور استنبول کی مسجدوں کو تحیر سے دیکھا ہے نوٹری ڈیم۔ کولون کا کلیسا۔ آیا صوفیہ کا گنبد۔ مسجد سلطان فاتح۔ خدا نے دکھایا تو اور بہت کچھ دیکھنا باقی ہے لیکن قرون وسطیٰ کے جس آسیبی اور الف لیلوی ماحول میں آج برن کی گلیوں میں اس تنہا نے گشت کی ہے۔ اس کا بیان محال ہے۔ آج بہت دن بعد چاند نظر آیا، جانے کس تاریخ کا ہے۔ برن کے بازاروں کے پرانے محرابی راستوں میں جانے کہاں سے چلے کہاں جا نکلے۔ کلاک ٹاور سے آگے گزر کر سڑک کا نام پڑھا۔ اچھا تو یہ کرام گاسے ہے۔ یہاں مارکیٹ گاسے کی سی چہل پہل نہیں ہے۔ شب اترنے لگی ہے۔ لوگ رخصت ہونے لگے ہیں۔ کاریں موٹریں بھی اِکا دُکا گزر رہی ہیں یہ بھی پکی اینٹوں کا راستہ ہے۔ عین سڑک بیچ فوارے کا مینار آ گیا جس پر کوئی پیکر بھی بنا ہوا ہے اب سڑک کی اترائی شروع ہو گئی ہے۔ دیکھئے کہاں تک جاتی ہے۔ دورویہ محرابیں ہی محرابیں ہیں۔ دونوں طرف چیزیں بیچنے والوں کی دکانیں کہیں کوئی چائے خانہ بھی ہے یا بیر کا پیپہ پڑا ہے۔ برآمدہ اونچا ہے تو سڑک پر اترنے کے لئے سیڑھیاں بنا دی ہیں اور نیچے۔ اور نیچے، لیجئے پل کا خاکہ نظر آنے لگا۔ افوہ! نیچے دریا ہے۔ دریا کے ساتھ سڑک ہے۔ چھ چھ سات سات منزل کے مکان ہیں جن کی چھتیں پھر بھی پل کے برابر نہیں پہنچتیں۔ اس اونچائی سے کاریں اور چلتے پھرتے لوگ بھی چھوٹے محسوس ہوتے ہیں۔ اب پل کا سرا آ گیا لوٹنا چاہئے۔ واپس کرام گاسے۔ لیکن نہیں۔ یہ بائیں ہاتھ کی ویران گلی دل کو کھینچ رہی ہے۔ جنکرن گاسے۔ یہاں تو قدامت کی چھاپ کچھ اور گہری ہے۔ موٹے آثار کی چوڑی اور نیچی گول محرابیں۔ وہی کہ اصفہان کے مسقف

بازار میں ملتی ہیں لیکن انکی نسبت پست۔ تین صدی پہلے کی تو ہوں گی۔ سناٹا۔ کسی پراسرار فلم کا سا سین ہے۔ روشنی بھی کم کم۔ کہیں کہیں کوئی دوکان کھلی بھی ہے لیکن گاہکوں کے لئے نہیں دکاندار بیٹھا دن بھر کی کمائی کا حساب جوڑ رہا ہے۔ لیمپوں کے سائے عجب عجب شکلیں بنا رہے ہیں۔ لیجئے کھلا احاطہ آ گیا اور پندرہویں صدی کے مشہور گرجا نائیدگ کرک کی پشت۔

یہاں سے ایک تنگ سیڑھیوں کا سلسلہ نیچے کہیں اتر گیا تھا۔ ان نیم تاریک سیڑھیوں میں بے سمجھے اترنا ہے۔ خطرناک جانے کہاں پہنچا دیں لیکن دیکھا جائے۔ 50 سیڑھیاں، پھر موڑ، پھر 40 سیڑھیاں، پھر موڑ۔ اگلے موڑ کے پیچھے سے قدموں کی چاپ آ رہی ہے۔ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ ہم جیسا خدائی خوار۔ گلا گھونٹنے والا۔ نہیں یہ تو کوئی طالب علم سا لگتا ہے بغل میں کتابیں ہیں۔ نیچے کنارِ دریا کی آبادی سے آ رہا ہو گا۔ اگلا موڑ۔ لیکن یہ تو لامتناہی سلسلہ ہے اب واپس۔ اب قدموں کی چاپ اوپر سے آنی شروع ہو گئی۔ نیچے کے راستے میں اب کوئی نہیں ہے کیونکہ صدیوں پرانی ان بوسیدہ سیڑھیوں پر تھوڑی سی آہٹ بھی بہت گونجتی ہے۔ ہم اس راستے کے اُدھر میں ہوں گے اب اوپر کی چاپ قریب آ رہی ہے۔ کھٹ کھٹ کھٹ۔ ارے یہ تو کوئی لڑکی ہے۔ ارے لڑکی تو اس ویرانی اور سناٹے میں کہاں سے آ گئی۔ کیا تجھے کسی کا ڈر نہیں، نیچے کنارِ دریا پر کس کی کشش تجھے لے جا رہی ہے۔ کھٹ کھٹ کھٹ۔ خوشبو کا ایک جھونکا پاس سے گزر بھی گیا۔ اوپر گرجا کا احاطہ۔ احاطے میں پھولوں اور پودوں کی روشیں کونوں پر شش پہلو سرخ محافظوں کو کوٹھڑیاں۔ دور احاطے کی دیوار، اس کے ساتھ دو سائے باش اے اجنبی ان کے رنگ میں بھنگ نہ ڈالنی چاہیے۔ اب ذرا دیوار کی منڈیر پر جھک کر نیچے دیکھو۔ یار خدایا۔ کیا منظر ہے، دریا راستے مکان۔ دریچے۔ دریچوں میں روشنی، روشنی میں لوگ۔ اچھے لوگ، بُرے لوگ، شاد لوگ، ناشاد لوگ اپنے آپ میں گم۔ دوسرے انسانوں کے غموں اور خوشیوں سے بے پروا۔

اور اے گرجا۔ تو جو پانچ سو سال سے سربلند کھڑا ہے تو نے کس کس کو سرنگوں دیکھا ہے یہ تیرے ماتھے پر مجسموں کا جال کیسا ہے اِدھر بخشے جانے والوں کے پیکروں کا ہجوم ہے۔

www.pakistanipoint.com

ادھر مقہورین اور مغضوبین کا۔ افوہ گیارہ بج گئے کیا؟ پہلے سریلی گھنٹوں کا سلسلہ، پھر گھن گرج، اچھا رخصت۔ لوگ آئیں گے دیکھیں گے چلے جائیں گے۔ تو یونہی پا بگل کھڑا گجر بجاتا رہے گا۔ اے عظمت استادہ ہم فانی ہی سہی لیکن تجھ سے مجبور نہیں۔ دور دور کی منزلوں میں قدم ماریں گے اور وہاں جا آرام کریں گے۔ جہاں سب آرام کرتے ہیں۔ ہم تیرے شکوہ اور سربلندی پر تحیر ضرور کریں گے۔ لیکن رشک نہیں، پانچ سو برس تک کوچہ جنکرن گاسے کی اداس محرابوں والی گلی اور دریا کے درمیان بے حس و حرکت کھڑے رہنا ہمیں منظور نہیں۔ ہرگز منظور نہیں۔

www.pakistanipoint.com

زیورخ تک براستہ بٹھنڈہ

یہ عجب اتفاق ہے کہ جہاں ہم جس ہوٹل میں ٹھہریں آس پاس مرمت کا کام بہت نکل آتا ہے۔ جنیوا والے ہوٹل کے سامنے سڑک برائے مرمت بند ہے، کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اور دن بھر جنیوا کے 'کے ڈی اے' والے خاک اڑاتے رہتے تھے۔ برن میں ہماری آمد کی اطلاع پاتے ہی ان لوگوں نے ایک بہت اونچی سی کرین ہماری کھڑکی کے سامنے لا کھڑی کی اور شب بھر گڑ گڑ دھڑ دھڑ ہوتی رہی۔ ایمسٹرڈم کے ہوٹل کے ساتھ ہی ان دنوں ایک شخص کو اپنا پرانا مکان ڈھا کر نیا بنانے کی سوجھی تھی۔ ایک آدھ جگہ کی تو خیر تھی لیکن ہر جگہ ہر شہر میں اس کا التزام محض اتفاق کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا۔ مرمت کے ذکر پر یاد آیا کہ کام تو رفو کا ہمارے دل میں بھی بہت ہے لیکن کاریگر اس کے پاکستان میں ہیں۔

برن میں دوسری صبح ہر طرف دھند ہی دھند تھی لیکن ہمارے پاؤں میں چکر۔ نو بجے چل نکلے سب طرف سڑکوں اور موٹروں کی بتیاں جل رہی تھیں۔

کلاک ٹاور کے پاس سے نکل کر چن فیلڈ پل سے دریا پار کیا تو سامنے برجوں والا ایک قلعہ نظر آیا۔ اور اس کے سامنے چوک میں مجسموں کا ایک سلسلہ۔ لیکن ہماری منزل ایک لائبریری تھی۔ لہٰذا حلویتا اسٹریٹ پکڑی اور ایک دو جگہ بھٹک کر اور پوچھ کر منزل پر پہنچ گئے۔ یہاں ہمیں کچھ ایسا کام نہ تھا بس دیکھنا تھا ہم نے جاتے ہی تعارف کرایا کہ ہم صاحب علم آدمی ہیں کوئی مخطوطے وغیرہ ہوں تو دکھا دو۔ معلوم ہوا کوئی نہیں۔ جرمن زبان کی کتابیں ہیں وہ بھی حوالے کی۔ ہم نے کہا اچھا یہ بات ہے تو سلام علیکم، خدا حافظ۔

www.pakistanipoint.com

زیورخ.....دریائے زیورخ کا ساحل

لیکن لائبریرین صاحبہ ہمیں یوں سستا چھوڑنے والی نہیں تھیں۔ انہوں نے ہمیں یونین کیٹلاگ کی تفصیل بتانی شروع کی۔ پھر ریڈنگ روم دکھایا اور کہا اس میں بیٹھ کر لوگ پڑھتے ہیں۔ پھر وہ خانے دکھائے جن میں انڈکس کارڈ رکھے تھے۔ پھر کہا۔ اوپر چلو۔ قطار در قطار کتابوں کی الماریاں بھی دکھاؤں۔

ہم نے کہا ہم نے سب سمجھ لیا۔ بہت اچھی لائبریری ہے۔ اللہ اس کی عمر دراز کرے۔

فرمایا۔ میں نے اپنی بات تو ابھی پوری نہیں کی۔ اور پھر انہوں نے اپنی بات پوری کرنی شروع کی۔ یونین کیٹلاگ۔ یونین کیٹلاگ۔ یونین کیٹلاگ۔

گاڑی تو ہماری ایک بجے جاتی تھی لیکن اس سے پہلے ہم وہ عجائب گھر دیکھ لینا چاہتے تھے جو پاس کے چوک میں واقع تھے۔ پھر ہمیں کلاک ٹاور جا کر گھنٹہ بجتے دیکھنا تھا۔ پھر ہمیں وہی کل رات والا پل پار کر کے ریچھوں کا بھٹ دیکھنا تھا اور وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔

ہم نے پھر کہا۔ ہم اس لائبریری کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ خدا حافظ۔

فرمایا: آپ نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے آپ کو جرمن کے پرانے رسالوں کے فائل

www.pakistanipoint.com

دکھاؤں۔

اور یوں ان کے اصرار اور ہمارے انکار میں ایک میوزیم کا تو وقت نہ رہا دوسرے کے لئے ہمارے پاس کُل ہم سات منٹ بچے۔ خیر ہم لوگ گرد پوش پڑھ کر کتاب پر فاضلانہ ریویو کرنے والے ہیں۔ ان سات منٹ میں برن کے ہسٹری اینڈ آرٹ میوزیم میں رکھی ہوئی چیزوں کی ہسٹری پر عبور حاصل کر کے اور آرٹ کے شاہکاروں کی مین میکھ نکال، دربان سے اپنا اوورکوٹ لے تھینک یو کہہ باہر آ گئے۔ ایک طواف مجسموں کا بھی کیا۔ اس میوزیم میں ہمارے نزدیک سب سے طرفہ چیز تو اس کی عمارت ہے۔ یہ وہی بُرجوں والا قلعہ تھا جسے ہم نے جاتے ہوئے دیکھا تھا تو نہ جانے کیا سمجھا تھا۔ یہ ساری جلدی اس بات کی تھی کہ بارہ بجے کلاک ٹاور پہنچ جائیں۔ اس کلاک ٹاور میں جب گھنٹہ پورا ہونے کا وقت آتا ہے تو ریچھوں اور گھڑ سواروں کی ایک قطار گھومتی ہوئی نکلتی ہے اور ڈیوک زارنگن کا بت دونوں ہاتھوں سے گھڑیال بجاتا ہے۔ یہ طرفہ تماشا دیکھنے کو جو نہ جانے کب سے جاری ہے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ ہم نے بھی جب تک یہ نہ دیکھ لیا۔ کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا۔

اب ہم نے پھر کل رات والا راستہ پکڑا۔ کرم گا سے اور اس سے آگے پرانا پل اور گرجا اور پھر ریچھوں کا بھٹ۔ ریچھ اس شہر کا نشان ہے۔ جھنڈے پر ریچھ، مہر پر ریچھ، ڈھال پر ریچھ۔ کہتے ہیں ڈیوک آف زارنگن نے یہ شہر بسانے کا خیال کیا تو عہد کیا کہ اس کے نواحات میں شکار میں جو جانور سب سے پہلے ہاتھ لگے اس پر شہر کا نام رکھا جائے گا۔ اور وہ جانور ریچھ تھا۔ پل پار کرنے پر دہنے ہاتھ کو ایک گہرا بھٹ ملے گا جس میں ریچھ رکھے گئے ہیں۔ بلکہ دو بھٹ ہیں جن کے گرداگرد جنگلے ہیں۔ ایک میں بڑے ریچھ دوسرے میں ان کے بچے۔ یہ ریچھ کے بچے بڑے کھلنڈرے اور معصوم صورت ہیں۔ لوگ ان کو دیکھنے دور دور سے آتے ہیں۔ کسی کو اوپر کھڑا دیکھتے ہیں تو پچھلے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سلام کرتے ہیں۔ ناچتے ہیں کہ ابھی انعام ملے گا۔ کوئی اوپر سے گاجریں پھینکے گا۔ زیادہ تر تو

بے چاروں کی محنت رائیگاں جاتی ہی دیکھی۔ گاجریں تو ہم بھی نہ لائے تھے۔ سوچا پیسے پھینک دیں خود ہی خرید کر کھالیں گے پھر باز رہے کہ وطن پہنچ کر ہم بھی نظیر اکبر آبادی کی طرح ریچھ کا بچہ پالنے کی کوشش کریں گے۔

برن سے ریل میں بیٹھے تو پھر وہی خوبصورت وادیاں، چراگاہیں، چھوٹے چھوٹے مکان، چرتے ہوئے مویشی، اور جنگل اور پربت۔ ''دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو''، کی تمنا کرنے والا شاعر اقبال ان راستوں سے کئی بار گزرا۔ کیا عجب انہی مرغزاروں اور کہساروں نے اس سے یہ نظم لکھوائی۔

ہو ہاتھ کا سرہانا سبزے کا ہو بچھونا
پانی بھی موج بن کے اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا ذرا ہو

پربت، نیلا پربت، احمد بشیر، خیال بھٹکتا ہوا کہاں سے کہاں جا نکلا۔

سامنے کی سیٹ پر ایک بڑے میاں بیٹھے تھے پہلے انہوں نے ہم سے جرمن میں گفتگو شروع کی۔ جواب باصواب نہ ملا تو فرنچ پر آئے۔ ہم نے یہ وار بھی خالی دیا تو شاید اٹالین شروع کی۔ آخر ہم نے اردو میں کہا۔ بابا یہ فرنگی بولیاں ہمیں نہ آویں۔

گفتگو ریختے میں ہم سے کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے

آخر وہ ایک دوسرے بڈھے سے گفتگو میں جٹ گئے جو ان کی بات کا جواب دے کر سو جاتے اور ایک خراٹا لے کر پھر اٹھ جاتے۔ باتیں وہ اس ہمارے سامنے والے بڈھے سے کرتے تھے۔ دیکھتے ہمیں رہتے تھے ہم اور تو کیا بولتے۔ ہونکارا بھرنا شروع کر دیا۔ یا۔ یا۔ یعنی ہاں، ہاں، بجا فرمایا۔ بجا فرمایا۔

www.pakistanipoint.com

برلن کا کلاک ٹاور

www.pakistanipoint.com

اب اولٹن آ گیا۔ یہ ایک جنکشن ہے برن اور زیورخ کے درمیان۔ یہاں ہم نے اُتر، سامان امانت رکھوا، اپنی منزل کا پتہ پوچھنا شروع کیا۔ سارے پلیٹ فارم پر ایک بھی شخص انگریزی سمجھنے والا نہ ملا۔ اس پر ان لوگوں کو دعویٰ مہذب ہونے کا ہے۔ کوٹ پتلون پہنے پھرتے ہیں۔ آخر معلومات کے دفتر میں گئے۔ پتہ چلا یہ پل پار ہی ہماری منزل ہے۔ اس کے باوجود ہم تھوڑی دیر تک بھٹکتے پھرے، کچھ دانستہ کچھ نادانستہ۔

برن سے چلتے میں ہم نے ایک جگہ کافی پی تھی اور ساتھ میٹھے بسکٹ کھا لئے تھے۔ گاڑی ہماری پونے تین بجے پہنچی۔ ہم نے سوچا جن صاحب سے ملنے جا رہے ہیں وہ اس وقت تو خیر کافی پلائیں گے، اس کے ساتھ یہی بسکٹ کیک وغیرہ۔ پھر ہم گفتگو کریں گے تو بے تکلفی بڑھے گی۔ پھر وہ کہیں گے۔

کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات

ہم کہیں گے۔ نہیں نہیں۔ کیا تکلف ہے، ہم زیورخ پہنچ کر کھا لیں گے۔ وہ کہیں گے۔ واہ! ہم کھانا کھائے بغیر جانے نہ دیں گے بلکہ ہمارا تھیلا اٹھا کر چھپا لیں گے۔ آخر ہم ہتھیار ڈال دیں گے۔ کہانی والے بہرے کی طرح ہم یہ مکالمے سوچتے ان کے درِ دولت پر پہنچے۔ ان کی سیکرٹری نے کہا، وہ مصروف ہیں۔ ہم کچھ خفیف سے ہو کر بیٹھ گئے۔ اور کتابیں دیکھنے لگے۔ آدھے گھنٹے بعد ان کی سیکرٹری پھر آئیں اور بولیں، نیچے کی منزل میں کچھ کتابیں اور رکھی ہیں، وہ بھی چل کر دیکھ لیجئے۔ کیونکہ مسٹر فلاں ابھی تک مصروف ہیں۔ ایک صاحب سے گفتگو کر رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ سے ملیں گے۔

آخر مسٹر فلاں ملے۔ بڑی اچھی طبیعت کے آدمی ہیں۔ انہیں کچھ معلومات درکار تھیں جو ہم مہیا کرتے رہے۔ پھر ہم نے کچھ پوچھا۔ انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے جواب دیا۔ ہمارے پیٹ کی کھد بد ہمیں نڈھال کئے دے رہی تھی لیکن اس اللہ کے بندے نے ہم سے اسکول ہی کی بات کی۔ یہ نہ بتایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی۔

www.pakistanipoint.com

یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو ہم نے پونے پانچ ہی بجے اجازت چاہی۔ انہوں نے کہا۔ اچھا تو آپ جائیں گے۔ یہ کہہ کر دروازے تک چھوڑنے آئے۔ گاڑی ہماری سوا چھ بجے چلتی تھی لیکن ہم ڈگ بھرتے اسٹیشن پہنچے۔ باہر ایک مونگ پھلی والا کھڑا تھا۔ اس سے مونگ پھلی لی اور اندر جا کر پوچھا۔ کوئی گاڑی ہے زیورخ جانے والی اس وقت۔

جواب ملا۔ ''سیدھی گاڑی سوا چھ بجے جائے گی۔''

ہم نے کہا۔ ''سیدھی الٹی سے مطلب نہیں۔ ہم فوراً جانے والی گاڑی مانگتا۔''

ٹکٹ بابو نے کہا۔ ''ہاں پانچ بج کر تین منٹ پر ایک گاڑی جاتی ہے لیکن پسنجر ہے۔ بڑا چکر کاٹ کر برگ کے رستے جائے گی۔ اور قریب قریب اس وقت پہنچے گی جب سوا چھ والی ایکسپریس ٹرین۔''

ہم نے سامان لیا اور پلیٹ فارم 2 کی طرف ایک جست کی۔ گارڈ نے بھی ہمیں روکنے کی بہت کوشش کی کہ یہ پسنجر ہے اس میں مت بیٹھو لیکن ہم نے مان کر نہ دیا اور کہا یہ رہا زیورخ کا ٹکٹ۔ اگر اور پیسے بنتے ہیں تو بولو۔ لیکن اولٹن اسٹیشن پر بیٹھ کر انتظار کرنے کی بجائے چلتی گاڑی میں بیٹھے رہنا اچھا۔ اور یوں ہم نے براستہ بھٹنڈہ جانے والی پسنجر ٹرین میں مونگ پھلی ٹھونگتے سفر کیا۔

جو لوگ دیہات یا چھوٹے قصبوں میں بڑھے پلے نہیں وہ برانچ لائنوں اور پسنجر گاڑیوں کا لطف کیا جانیں۔

یہ گاڑی بھی ذرا سا چلتی تھی اور رُک جاتی تھی جیسے جھولے کی بیماری ہو۔ مسافر آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے۔ پہلے اسٹیشن سے بچے سوار ہوئے دوسرے سے دیہاتیوں کا ایک غول سیٹوں پر پھسکڑے مار کر بیٹھ گیا اور گاجریں کھانے لگے۔ اب ہمیں اپنی گاڑیاں یاد آئیں۔ تہمد باندھے ہوئے بڈھے ان کے بقچے اور گٹھڑیاں۔ کسی میں گڑ، کسی میں چاول، کسی میں تمباکو، کسی نے نئی ہنڈیا، یا ایلومینیم کی پرات خریدی ہے۔ کسی کے

www.pakistanipoint.com

پاس نئی چنگیر ہے۔ تولئے میں نمک کے ڈبے بندھے ہیں۔ قصبے میں خریداری کرنے آئے تھے۔ جن عورتوں سے سیٹوں پر بیٹھا نہیں گیا۔ وہ فرش پر یا کسی ٹرنک پر بیٹھ گئیں اور بھنے دانے نکال کر کھانے شروع کئے۔ اب گاڑی کھڑی ہے اور کھڑی ہے کیونکہ کسی اور لاڈلی گاڑی کو پہلے گزرنا ہے۔ ایک بڑے میاں نے فرش کے کونے کھدروں سے کاغذ اور تنکے جمع کئے۔ اور فرش پر آگ جلا کر حقہ بھرا۔ کوئی ہمت والا دوڑ کر گیا اور پاس کے کھیت سے گنے اکھاڑ لایا۔ اور اب گاڑی کے اندر ہی چھلکوں کا ڈھیر لگ گیا ہے۔ ابھی ان کی منزل دور ہے۔ کوئی اگلے سگنل پر اتر جائے گا۔ کوئی اسٹیشن پر۔ پھر کوئی بہت طرہ باز خاں ہوا تو تانگہ ڈھونڈے گا ورنہ سامان کی گٹھڑیاں، ٹرنک، دیگچے سر پر رکھے، بقچیاں بغلوں میں داب شام کے جھٹپٹے میں کھیتوں کی پگڈنڈیوں میں گاؤں کی راہ لیں گے۔

پھر گاڑی کھڑی ہو گئی اور ہمارے تصور کی آنکھ کھل گئی۔ ہمیں تو یہاں کے دیہاتی اسٹیشنوں پر بس ایک ہی آدمی نظر آیا۔ اسی نے بھاگ کر کانٹا بدلا۔ اسی نے جھنڈی دی۔ اسی نے لوگوں سے ٹکٹ وصول کئے۔ غالباً اسٹیشن ماسٹر ہوگا۔

ہمارے ہاں بغیر ٹکٹ سفر کرنے کی عادت عام ہے۔ ہم نے بھی بچپن میں کئی بار کیا ہے یہاں کے لوگ بلاٹکٹ سفر نہیں کرتے۔ اس کی ایک وجہ تو ان کی طبعی ایمانداری ہے۔ دوسری شاید یہ ہو کہ چیکنگ بڑی سخت ہے۔ اسٹیشن چھوٹا ہو یا بڑا ہو چیکر ضرور آئے گا۔ اور ٹکٹ میں سوراخ کرے گا۔ زیورخ کے قریب پہنچتے پہنچتے پندرہ جگہ کٹ کر ہمارے ٹکٹ کا یہ حال ہوا تھا کہ پڑھا نہ جاتا تھا کہاں کا ہے اور ٹکٹ ہی ہے یا کچھ اور۔ زیورخ سے دو اسٹیشن ادھر یہ آخری بار کٹا اور ختم ہو گیا۔ اگلے اسٹیشن پر ہم نے چیکر سے کہا کہ وہ جس پر آپ اپنی مشقِ ناز کرتے تھے وہ تو نہیں رہا۔ اب میری انگلی اس آلے سے کاٹ لیجئے۔ اور زیورخ میں مجھے بغلی دروازے سے نکال دیجئے گا کہیں کوئی بلاٹکٹ سمجھ کر پکڑ لے۔

جرمنی میں، ہالینڈ میں، سوئٹزرلینڈ میں ٹراموں اور بسوں کا بھی یہی دستور ہے۔ ہماری

www.kitaabghar.com

ٹرام کی طرح بیسیوں دروازے نہیں کہ چیکر ڈال ڈال اور مسافر پات پات، اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے۔ بس ایک دروازہ ہے۔ اس میں سے آیئے ٹکٹ بابو کے سامنے سے گزریئے وہ ہر ایک کو ٹکٹ دے گا یا چیک کرے گا جب جی چاہے گا ایک بٹن دبا کر سارے دروازے بند کر دے گا۔ جب چاہے گا کھولے گا۔

ایک بڑے میاں بندوق لئے اپنے خربوزوں کے کھیت پر پہرہ دے رہے تھے۔ ایک راہ گیر نے کہا۔ کیسے ہیں یہاں کے لوگ؟ بڑے میاں بولے بڑے ایماندار ہیں۔ کیا مجال جو میرے خربوزوں کو ہاتھ لگائیں۔ راہ گیر نے کہا یہ بندوق آپ نے کیوں سنبھال رکھی ہے۔ بڑے میاں بولے ان کو ایماندار رکھنے کے لئے۔

اس ایک جواب میں یورپ والوں کی ایمانداری کی فلاسفی آ جاتی ہے پوری نہیں تو بڑی حد تک۔

www.pakistanipoint.com

پھر پیرس

12 نومبر 1967ء

www.pakistanipoint.com

www.pdfstampInt.com

شامتِ اعمال ماصورتِ پیرس گرفت

زیورخ سے جہاز اچھا خاصا سیدھا پراگ جاتا تھا لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے شامتِ اعمالِ ماصورتِ پیرس گرفت۔ ہم نے سوچا جلدی کیا ہے۔ اتوار کی صبح پیرس چلے جائیں۔ ایک شام اور شب وہاں گزار دیں، دوستوں سے مل لیں۔ پیر کی دوپہر پراگ روانہ ہو جائیں گے۔ لہٰذا ایک جرمن دوست کو جو پیرس میں رہتے تھے، ایکسپریس تار سے مطلع کیا کہ ہم نزولِ اجلال فرما رہے ہیں۔ ہمارے لئے کوئی مناسب ہوٹل مقرر کر دو اور ہاشم کو پاکستانی سفارت خانہ میں فون کر دو کہ رات کو اپنے سالن میں تھوڑا پانی اور ڈال لے اور بازار سے دو روٹیاں فالتو منگا لے۔

سوئٹزرلینڈ کے لئے ہمیں جو جیب خرچ ملا تھا وہ ہفتے کی شام تک سلفہ ہو چکا تھا۔ زیورخ میں ایک شب اور ٹھہرتے تو ساڑھے سترہ فرانک اور جاتے۔ پچھلی بار ہوٹل مالار میں ہم پچیس فرانک دیتے تھے۔ بعد میں تو ایک پاکستانی ناصح مشفق نے بتایا کہ تم تو گھر لٹا رہے ہو۔ میں تو پیرس میں عین یونیسکو کے دفتر کے بغل میں کوچہ گیری بالڈی کے ہوصل رزایو میں پندرہ فرانک میں ٹھہرا تھا بس وہاں چلے جانا۔ ایک رات کی تو بات ہے۔ اچھا بھلے مانسوں کا ہوٹل ہے۔ البتہ انگریزی وہ نہیں جانتے۔ فرنچ بولتے ہیں۔ ہم نے کہا مضائقہ نہیں۔ ہم بھی بہت فرنچ جانتے ہیں، وہ ہم سے زیادہ تھوڑی جانتے ہوں گے۔ احتیاطاً ہم نے اپنے بجٹ میں ہوٹل کے لئے بیس فرانک کی مد نکالی، ایک وقت کا کھانا ہاشم کے ہاں

فرض کیا دوسرے وقت سینڈوچوں کے لئے پانچ فرانک رکھے، باقی ٹیکسی قلی بس وغیرہ کے لئے آٹھ دس اور ارادہ یہ تھا کہ پیرس میں اتر کر ہوٹل میں سامان رکھ سیدھا میوزیم لودر کا رخ کریں گے۔ ایک تو آرٹ کے شاہکار دیکھ کر ذہن میں کچھ وسعت اور علمیت میں کچھ نکھار پیدا ہوگا۔ دوسرے پیسے بچیں گے جو بازار میں گھومنے پھرنے کی صورت میں لامحالہ خرچ ہوتے ہیں۔

لیکن وہ جرمن دوست اخلاق کا مارا ہمیں ہوائی اڈے پر لینے پہنچ گیا۔ بولا ہوٹل تمہارے لئے ٹھیک کر دیا ہے۔ مناسب داموں کا ہے اور یونیسکو سے چنداں دور نہیں لیکن اس وقت تو سامان میری کار میں رکھو۔ میرے گھر چلو۔ دوپہر کا کھانا میرے ہاں۔ شام کے پانچ بجے تک کے لئے میں فارغ ہوں۔ باتیں کریں گے، شام کو تمہارے ہوٹل تمہیں چھوڑ آؤں گا اور ہاں میرا گھر ورسائی کے پاس ہے۔ تم نے ورسائی کا محل نہیں دیکھا وہ بھی دکھا دوں گا۔

ہم نے کہا ''ہمارا عزم تو لوور کا تھا''۔

بولے لوور، رات کو دیکھ لینا۔

ہم نے کہا: ''رات کو کھلا رہتا ہے''۔

بولے: ''ہاں۔ رات کو تو نہیں کھلا رہتا''۔

یہ صاحب پاکستان میں رہ چکے تھے اپنے گھر میں انہوں نے پاکستان کے پیالے بدھنے۔ توے پراتیں، ایک دو بے ڈول سی ڈھولکیاں، کان جھڑی سارنگیاں اور اونٹ کی کھال کا یاک لیمپ سجا رکھا تھا جس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی بڑے فخر سے دکھاتے رہے۔ ایک کتا بھی وہ پاکستان سے اپنے ساتھ لے گئے تھے جس کا نام کراچی خاں رکھا تھا اور اس سے اردو بولتے تھے (بہت اچھا۔ گرم پانی۔ شکریہ چائے لاؤ وغیرہ) اس سے انہوں نے

www.pakistanipoint.com

ہمارا تعارف کرایا۔ ہمارے ہاتھ چٹوائے، ہماری پتلون چٹوائی، ہمارا تھیلا چٹوایا۔ ہم کتوں کو منہ نہیں لگاتے۔ منہ تو کیا ہاتھ تک نہیں لگاتے لیکن اس وقت جی کڑا کر کے نہایت خندہ پیشانی سے خواجہ سگ پرست بنے رہے کہ اگر بیزاری دکھائی، تو یہ شخص کہے گا کہ دیکھو اس شخص کو پاکستان اور پاکستان کی چیزوں سے اتنی بھی محبت نہیں ہے۔ وہ تو ہم نے باتوں باتوں میں جتا دیا کہ ہم محبت کی ظاہری نمائش پسند نہیں کرتے ورنہ کیا عجب وہ ہمیں اور اس کتے کو کھانا بھی ایک ہی پلیٹ میں ڈال دیتے کیونکہ وہ پاکستان میں کئی کئی آدمیوں کو ایک ہی پلیٹ میں کھاتے اور ایک ہی ڈونگے سے ایک ہی مٹکے میں سے نکال نکال کر پانی پیتے دیکھ چکے تھے اور اسے مستحسن بتاتے تھے کہ آپس میں محبت اور اخوت بڑھانے کا عمدہ ذریعہ ہے۔

ورسائی کے رستے میں ہم نے یونہی پوچھ لیا کہ یہ ہوٹل جو آپ نے ہمارے لئے پسند کیا ہے۔ کیا نام ہے اس کا، کیا دام ہیں اس کے؟

بولے: ''ڈربی ہوٹل نام ہے۔ پینتالیس فرانک کا ہوگا۔ اس سے زیادہ کا کیا ہوگا۔''

ہم نے کہا۔ ''مذاق کو چھوڑیئے، سچ سچ بتایئے؟

فرمایا: مذاق کی کیا بات ہے۔ 45 فرانک کچھ زیادہ تو نہیں۔

ہم نے کہا۔ ''آپ کو معلوم ہے ہم کوئی ریسیے تو ہیں نہیں۔ ہمیں کھانے پینے، کپڑے، دھوبی، نائی، بس گاڑی یہ وہ سارے اخراجات کے لئے کل چالیس فرانک ملتے ہیں اور اب چونکہ ہم فرانس اپنی خوشی سے آئے ہیں، یہ بھی نہ ملیں گے۔ ہمارا انتظام تو پندرہ سولہ فرانک والے ہوٹل میں کیا ہوتا بلکہ لیٹن کوارٹرز میں تو سات آٹھ فرانک روز والے ہوٹل بھی ہیں۔

بولے: ''اب تو ہو گیا''

''45 رانک..... 45 فرانک، خداوند! ہم یہ کیسے دیں گے۔ کہاں سے دیں

گے۔ ہمارا تو سارا اندوختہ پانچ پونڈ ہے۔ یعنی کوئی ساٹھ پینسٹھ فرانک اور ابھی اتنا لمبا سفر ہے''۔ ہم اس اُدھیڑ بن میں لگ گئے۔ فرمایا۔ یہ سامنے ورسائی کا محل ہے۔ اس میں پہلی جنگ عظیم کے بعد وہ معاہدہ ہوا تھا جسے معاہدہ ورسائی کہتے ہیں۔

ہم نے کہا۔'اچھا ہے'(لیکن یہ 45 فرانک کا کیا ہوگا)

بولے۔''خوبصورت ہے نا؟''

ہم نے کہا۔'بہت خوبصورت ہے(45 فرانک) کیا کہنے(45 فرانک)

اب انہوں نے محل کے احاطے کے باہر اپنی گاڑی ایک جگہ کھڑی کر دی اور کہا آؤ تمہیں پارک دکھاؤں۔

ہماری آتشِ شوق اس دوران سرد ہو چکی تھی۔ ہم نے کہا۔''نہیں اب شہر چلیں گے۔'' (45 فرانک)

بولے۔ واہ پارک دیکھے بغیر چلے جاؤ گے۔ یہ دیکھو یہاں سے آ کر ذرا منظر دیکھو کتنی دور تک روشوں کا سلسلہ چلا گیا ہے اور وہ دور نہر کا پانی دیکھ رہے رہو۔ ہم نے کہا۔'نہر کا پانی؟ ہاں ہاں دیکھ رہے ہیں۔'(45 فرانک)

اب وہ بولے۔'اب تمہیں دوسری طرف کا پارک دکھاؤں۔ ذرا دیکھنا کہ پھولوں اور پودوں کا تناسب کتنا آرٹسٹک ہے اور یہ بت اور یہ مجسمے!

ہم نے کہا۔''ہاں یہ بت، یہ مجسمے۔ بڑی عالی شان چیزیں ہیں۔ اب چلیں شہر بولے ابھی نہیں۔ ابھی تو بائیں ہاتھ کا پارک دیکھنا ہے۔

ہم نے کہا نہ بس۔ ہم تو اتنا ہی دیکھ کر مبہوت ہو گئے۔ واللہ بہت ہی طبیعت خوش ہوئی (اے شخص! تجھے تو تنخواہ پیرس میں فرانکوں میں ملتی ہے ہمارا تو بیڑہ ڈبو دیا۔ تُو نے)

واپسی میں ٹریفک کے رش میں خاصا وقت لگا۔ خاصا اندھیرا ہو چلا تھا جب ہم ہوٹل

www.pakistanipoint.com

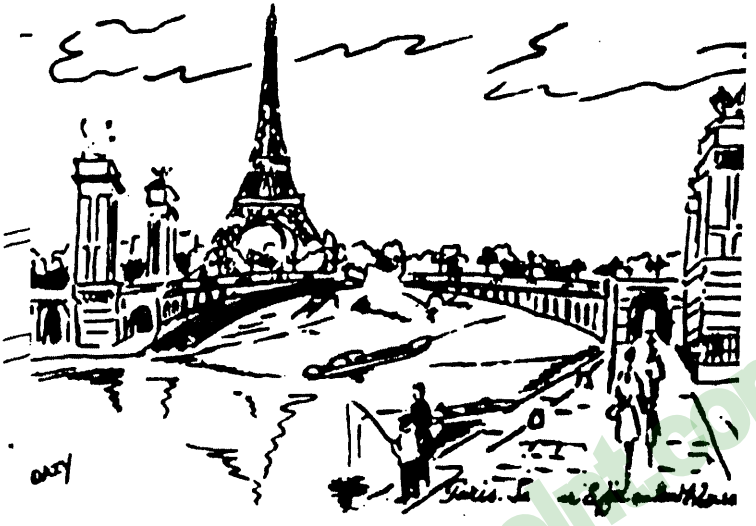

پہنچے ہیں۔ جرمن دوست نے باہر ہی سے ہاتھ ملایا اور روانہ ہو گئے۔

ہم نے ڈرتے ڈرتے ہوٹل میں قدم رکھا۔ کونٹر پر ایک ترش رُو صاحبہ بیٹھی تھیں۔

ہماری زبان سے پورا فقرہ بھی نہ نکلا۔ سب صرف ونحو بھول گئے تھے۔

ہم نے کہا ''کمرہ۔ ہمارا نام ابنِ انشا''

بولیں۔ ہاں ہاں سن لیا۔ کمرہ نمبر 8 تیار ہے۔

''کِتے کا ہے؟''

فرمایا۔ ''چھیاسٹھ فرانک کا!''

ہمیں یقین نہ آیا۔ دوبارہ پوچھا۔

بولیں۔ ''ساٹھ جمع چھ۔ چھیاسٹھ۔ کمرے کے ساتھ باتھ روم بھی تو ہے''۔

ہم نے کہا۔ ''باتھ روم کیوں ہے۔ ہمیں تو بس چھوٹا سا سنگل کمرہ چاہئے تھا۔ نہانے کا ہمارے سامنے نام مت لو۔ ہم افیم کھاتے ہیں یوں بھی سردی کا موسم ہے۔ پانی گیلا ہوتا

www.pakistanipoint.com

ہے نا۔''

بولیں۔''یہی کمرہ ہے۔اور کوئی نہیں''۔

'' 45 فرانک کا بھی نہیں؟''

''نہیں''

ہم نے کہا۔''اگر ہم کسی اور ہوٹل میں چلے جائیں تو؟''

فرمایا۔''شوق سے چلے جایئے۔لیکن کل۔یہ ایک دن کے تو چھیاسٹھ فرانک ہم وصول کریں گے ہی۔''

ہم نے دروازے کی طرف دیکھا وہاں گھنی مونچھوں والا ایک ہٹا کٹا دربان کھڑا خشونت سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ہم نے کہا''ہم تو یونہی کہہ رہے تھے۔مذاق کر رہے تھے۔ بھلا اور کہیں جانے کا کیا سوال ہے۔ہمیں تو کوئی کہے بھی تو نہ جائیں''۔

www.pakistanipoint.com

ڈربی (ہوٹل) کی ریس کون جیتا؟

کمرہ نمبر 8 ڈربی ہوٹل۔ ڈربی کے نام پر ہم گھوڑے کی طرح ہنہنائے اپنے سوٹ کیس پر دولتی جھاڑی۔ گھسی ہوئی دری۔ ٹیڑھی دیواریں۔ کمرے کے دو حصے تھے۔ دونوں میں ایک ایک پلنگ۔ ہم نے بجلی کا بٹن دبایا تو کمرے کے دوسرے حصے میں روشنی ہوئی۔ وہاں بھی ایک بٹن تھا۔ اس سے اِدھر کا کمرہ روشن ہوا۔ غسل خانہ بھی تھا اور دروازے کے اندر ایک نوٹس بھی لٹکا تھا کہ اس کمرے میں تین آدمی رہیں تو 78 فرانک دیں۔ دو رہیں تو 70 فرانک اور ایک آدمی ہو تو فقط 66 فرانک۔ ہم نے غنیمت جانا کہ ہم ایک ہی آدمی ہیں۔ ورنہ 78 فرانک دینے پڑتے۔ 18 فرانک کی تو سیدھی سیدھی یہ بچت ہوگئی۔

ہم نے ٹیلی فون اٹھایا۔ پاکستان سفارت خانہ۔ ''ہاشم''

بولے۔ ''ہاں آ گئے۔ آ جاؤ''

''کیسے آئیں؟''

بولے۔ ''پیرس میں ٹیکسیوں کی کمی نہیں ہے۔''

ہم نے کہا: ہم سے ٹیکسی ویکسی کی بات مت کرو۔ ہم تو شہر کو پیدل چل کر دیکھنے کے عادی ہیں اور پھر پیرس جیسا شہر! تمہارا گھر دور تو ہے لیکن پہنچ جائیں گے کوئی پون گھنٹے ہیں۔ اور ہاں کھانا ملنا چاہیے کہیں کافی وغیرہ پر ٹالنے کی کوشش کرو۔!

بھٹکتے، نقشہ دیکھتے، سڑکوں کے نام پڑھتے۔ پانچ پونڈ کو تیرہ سے ضرب دے کر ان کے فرانک بناتے۔ جیبوں میں مختلف ملکوں کی نجی ریزگاری گنتے۔ ہاشم کے گھر پہنچ گئے۔

www.pakistanipoint.com

derby-hôtel
5, avenue duquesne, 5
paris 1791

ہم نے جاتے ہی کہا۔

''آدم بو۔ آدم بو کھانا کہاں ہے''۔

بولے یہاں نہیں ہے۔ ایک ویت نامی ریستوران میں کھلائیں گے تمہیں ایک دو دوست اور بھی ساتھ ہوں گے۔ کہو۔ سفر تو اچھا گزرا۔

ہم نے کہا: فضول باتیں ہم سے مت کرو۔

یہ ویت نامی ریستوران بہت پراسرار تھا۔ نیم تاریک کمروں میں جالے لگے ہوئے۔ فرش پر پھٹے کاغذوں اور کوڑے کے انبار۔ لکڑی اور ٹین کی جھولتی ہوئی کرسیاں، ایک پھوسڑے نکلا ہوا صوفہ۔ دیواروں پر کچھ پوسٹر۔ کچھ پتہ نہ چلا کہ ہنوئی والے ویت نامی ہیں یا سائیگاؤں والے۔ ہمارے ساتھ ایک صاحب فرنچ داں تھے۔ انہوں نے کونٹر پر جا کر طویل مذاکرات کئے اور اس کے بعد پیسے ادا کئے۔

ہم نے کہا: ''یہ کیا؟''

بولے: اس ریستوران کا دستور ہے پیسے پہلے لیتے ہیں۔ کھانا بعد میں دیتے ہیں۔ لاتے ہیں سُرور اول۔ دیتے ہیں شراب آخر۔

یہ ریستوران بس اللہ کی رحمت کا محمدی ہوٹل تھا۔ مٹلو عورتیں پتھر کی میزوں پر پوچی پھیرتی اور کھانا پر دستی ہوئی۔ ہم چھ ساڑھے چھ آدمی (ہاشم کی بیگم اور ان کا بچہ تین موئے بھی

www.pakistanipoint.com

ساتھ تھا) ایک چھوٹی سی میز پر آپس میں گھٹنے بھڑاتے ہوئے بیٹھے۔ چاول آئے۔ پیالوں میں کچھ دھوون سا آیا۔ پُر چینی ریستوران کا سا کھانا، لال مرچوں کی چٹنی بھی۔

دھوون تو ہم پی نہ سکے۔ چاولوں پر تھوڑا سا چکن کا ٹکڑا رکھا۔ مرچیں ڈالیں، اور چمچے سے نوش کر گئے۔ ہاشم نے مہذب بننے کی کوشش میں پہلے اپنا کانٹا زمین پر گرایا پھر بیگم کا کانٹا مانگا اور گرایا۔ ہاں کچھ چاول ہم نے بھی گرائے۔

اتنے میں گیارہ بجے کا عمل ہو گیا۔ ہوٹل ڈربی کے خیال سے وحشت ہو رہی تھی لہٰذا ہاشم سے ہم نے کہا آج ہمیں پیرس کی گلیوں میں گھماؤ۔

جانے یہ ریستوران کہاں واقع تھا اور ہم کن کن کوچوں سے ہو کر نکلے۔ بعض سڑکوں پر تو اس طرح چراغاں ہو رہا تھا۔ جیسے ہمارے ہاں نو دولتوں کی بیاہ شادیوں میں ہوتا ہے۔ شاید کرسمس کی ریہرسل تھی۔ یہ پرانی سبزی منڈی ہے جسے اب ڈھایا جا رہا ہے۔ یہ پگال ہے۔ عریاں کلبوں کی قطار در قطار۔ یہ شاتلے تیز روشنیوں تلے دعوتِ نظارہ اور دعوتِ نہ جانے کیا کیا! گاہک منڈلاتے ہوئے۔

ہم نے ہاشم سے کہا۔ خیر ہو چکی سیر۔ اب واپس!

''چھیاسٹم فرانک''

ہم نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی چیز ڈھنگ کی ہو تو بطور فرانس کی یادگار کے اپنے سوٹ کیس میں رکھ کر لیتے چلیں۔ سوائے کپڑے ٹانگنے کے معمولی ہنگروں کے کچھ بھی نہ تھا۔ نیند ہماری غائب ہو چکی تھی۔ ہم کاغذ پنسل لے کر بیٹھ گئے اور حساب جوڑنے لگے۔

ہمارا ارادہ تو پندرہ فرانک والے ہوٹل میں ٹھہرنے کا تھا لیکن ممکن ہے اس میں کمرہ نہ ملتا۔ لہٰذا پچیس فرانک دیتے۔ گویا یہاں فقط 41 فرانک زائد دے رہے ہیں۔ ہاشم کے گھر پیدل جا کر بچائے کم از کم پانچ فرانک۔ کل ایئر پورٹ پر قلی نہ لیں گے سامان خود اٹھائیں گے۔ مزید بچت تین فرانک۔ کل دوپہر فاقہ کریں گے کہ معدے کے فعل کو درست رکھتا ہے۔ ہاں چائے پی لیں گے۔ بچت چھ فرانک۔

www.pakistanipoint.com

بقیہ سفر میں اخبار نہیں خریدیں گے پانچ فرانک

بال نہیں کٹوائیں گے پانچ فرانک

گھر خط نہیں لکھیں گے دو فرانک

یہ ہو گئے چھبیس فرانک ابھی ہمیں پندرہ فرانک اور بچانے تھے۔

اچھا تو بیروں کو ٹپ بھی نہیں دیں گے۔ یہ مونچھوں والا دربان ہمیں یوں بھی پسند نہیں اور سوٹ کیس ہم خود اٹھا کر لائے تھے۔ مزید بچت تین فرانک۔

ان کا ایک تولیہ اٹھا کر اپنے سامان میں رکھ لیا۔ چار پانچ فرانک کا تو ہو گا ہی۔ لیکن اس پر تو ہوٹل ڈربی لکھا تھا اور پھر ہمارے سوٹ کیس میں جگہ بھی نہ تھی۔ لہٰذا اس خیال کو رد کر دیا۔ بلب اتارنے کا خیال بھی نہ جچا۔ کیونکہ ان لوگوں نے پیش بندی کر رکھی تھی۔ بہت اونچا لگا رکھا تھا اور ابھی ہمیں بارہ فرانک بچانے تھے۔ ہم نے سوچا۔ اتنا اونچا ہوٹل ہے۔ ناشتے میں انڈا ضرور دیں گے جو پندرہ بیس فرانک والے ہوٹل نہیں دیتے۔ آدھے فرانک کا انڈا ہوا۔ باقی ساڑھے گیارہ فرانک یاد آیا کہ لوور ہم نہیں جا پائے۔ جاتے تو ٹکٹ لینا پڑتا ورنہ گائیڈ بک یا کارڈ خریدتے تین ساڑھے تین فرانک اس میں لگانے چاہئیں۔

اب بس آٹھ فرانک کا حساب ہمیں اور جوڑنا تھا۔

کیوں نہ ان کا لفٹ بار بار استعمال کر کے ان کی بجلی خرچ کریں۔ سیڑھیوں پر سے اترنے میں جوتے کی جو گھسائی ہوتی ہے وہ بھی بچے گی۔ دو فرانک اس مد میں بھی بچائیں۔

باقی رہے چھ۔

ایش ٹرے اٹھا کر تھیلے میں ڈال لی۔ ایک فرانک اس کے دام لگائے۔ باقی پانچ فرانک۔

غسل خانے میں سے صابن بھی اٹھا کر تھیلے میں رکھا۔ باقی چار۔

اتنے میں یاد آیا کہ ایمسٹرڈم اور بون وغیرہ میں ڈھائی ڈھائی فرانک نہانے کے دیئے تھے۔ یہاں غسل خانہ موجود ہے۔ ایک اب نہائیں۔ ایک کل صبح اٹھ کر نہائیں یعنی

PAKISTANIPOINT.COM

پانچ فرانک یہ وصول کریں۔

گویا ایک فرانک کا فائدہ ہمیں رہا۔ ہمارا چہرہ خوشی سے کھِل گیا اور ہم کپڑوں سے باہر ہو کر ٹب میں بیٹھ گئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا توازنِ ادائیگی موافق ہونے کے باوجود ہمارے دل کا غبار ابھی تک پورا نہ دھلا تھا۔ لہٰذا ہم نے ٹب میں بیٹھ کر غزل گاتے ہوئے (ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آ سکے) خوب چھینٹے اڑائے کہ خود ہی فرش صاف کرتے پھریں گے۔ گویا ایک آدھ فرانک کے تلے اور ان لوگوں کو دبایا۔ ہم عموماً کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتے لیکن جو لوگ دوسروں کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ یہی ہونا چاہیے۔

پراگ ۱۳ نومبر تا ۱۷ نومبر، اور دارسا
کا ۱۸ نومبر تا ۲۰ نومبر، کا احوال لکھا نہیں جا سکا

www.pakistanipoint.com

ویانا

20,21 نومبر 1967ء

www.pakistanipoint.com

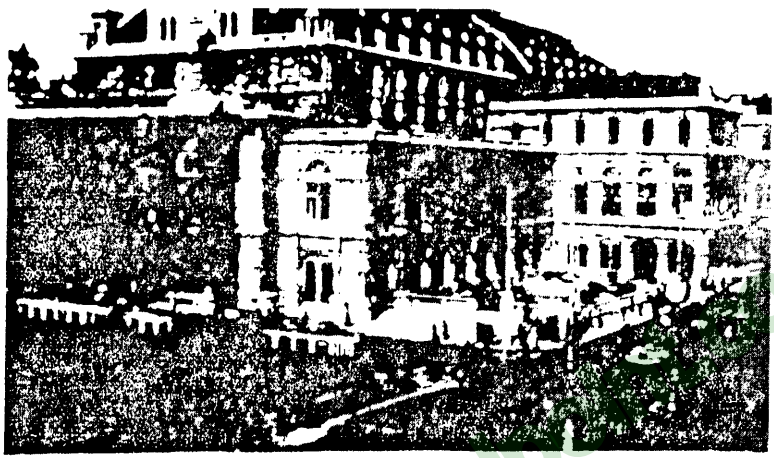

ویانا.....(اوپر) رنگ اسٹراس میں آپڑا (نیچے) مشہور بازار گرہین

www.pakistanipoint.com

ہم ویانا پہنچتے ہی ڈی ویلیو ہو گئے

مولوی محبوب عالم ویانا گئے تھے تو ہم کیوں نہ جاتے۔ یہ سچ ہے کہ آنکھوں والوں کے لئے ویانا میں بہت کچھ ہے۔ مثلاً آنکھوں کی پیچیدہ بیماریوں کے ہسپتال۔ ہمارے بہت سے آئی اسپشلسٹ یہیں سے بصیرت حاصل کر کے گئے ہیں۔ لیکن ہم جو اپنی سیدھی راہ چھوڑ کر ویانا گئے تو اس میں مولوی محبوب عالم سے ہمارے جذبہ مسابقت کو بہت دخل تھا۔ ویانا کسی طرح ہمارے پروگرام میں نہ آتا تھا اور سبھی ملکوں میں تو ہمارا کچھ نہ کچھ جھوٹا سچا منصبی کام تھا۔ یہاں ہمیں از خود رہنا اور اپنی گرہ سے خرچ کرنا تھا۔ ہم نے ہوائی اڈے پر آ کر فرمائش کی کہ کوئی سستا سا بغیر غسل خانے کا ہوٹل بتا دو۔ ہم نے تو سرائے کہا تھا لیکن یہ لفظ وہاں کوئی نہ سمجھا۔ انہوں نے کہا: اچھا۔ کانگریس ہوٹل میں چلے جاؤ۔ ایک سو بیس شلنگ روزانہ دے دینا۔ ہم نے کہا۔ ہم پرانے مسلم لیگی ہیں۔ آج تک کانگریس سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ اب اس میں کیوں داخل ہوں۔ اس پر اور غیر کانگریسی ہوٹل انہوں نے بتائے لیکن وہ زیادہ مہنگے تھے۔ آخر ہم نے کہا: میاں آزاد چلو وہیں چلو۔ شیر سیدھا تیرتا ہے وقت رفتن آب میں۔

ایک سو بیس شلنگ کچھ کم نہیں۔ ہم نے حساب لگایا تو بلبلا اٹھے لیکن یہ جان کر قدرے سکون ہوا کہ یہ برطانوی شلنگ نہیں ہیں بلکہ ایک ڈالر میں پچیس والے ہیں۔ ایک روپے میں پانچ جانئے۔ ڈالر والر کی کیا حقیقت ہے ہم پیسے والے آدمی ہیں۔ ہماری جیب میں پانچ پانچ پونڈ کے نوٹ تھے۔ ایک نہیں دو تین۔ ہم نے ایک پھینکا کہ لاؤ شلنگ دے دو۔

ایکسچینج والے نے اسی طرح اٹھا کر ہمیں دے دیا اور کہا۔ یہ نہیں چلے گا۔ اور سکہ ہے تو لاؤ۔

ہم نے کہا: کیوں کھوٹا ہے کیا؟

بولے: کھوٹے کھرے کا میں نہیں جانتا لیکن فی الحال اس کا بھاؤ نہیں نکلا۔

ہم نے کہا۔ بھاؤ ہم بتاتے ہیں ایک پاؤنڈ میں 2.80 ڈالر ہوتے ہیں۔ احتیاطاً لکھ لو۔

بولا: جی نہیں۔ اب نہیں ہوتے۔ آپ نے اخبار نہیں پڑھا۔ آج سے پونڈ ڈی ویلیو ہو گیا۔

ہماری آنکھوں کے آگے ستارے ناچنے لگے۔ ہمیں کبھی گمان نہ ہوا تھا کہ حکومت برطانیہ ہماری پشت میں یوں چھرا گھونپے گی۔ ہم سے صلاح کئے بغیر اسٹرلنگ کی قیمت گھٹا دے گی۔ یہ جو عرب ممالک کے اتنے سارے اسٹرلنگ برطانوی بینکوں میں ہیں ان کا کیا ہوگا۔ امیر کویت کو۔ شاہ سعودی عرب کو، سلطان ابوظہبی کو اور خود ہمیں برطانیہ کے اس عمل سے جو نقصان پہنچا ہے اس کی ذمہ داری کس پر ہے۔

ہم نے پورٹر سے پوچھا: میاں یہ سامان کہاں لئے جا رہے ہو ہمارا۔ ہماری اقتصادی حالت خراب ہو گئی ہے۔ کوئی جہاز قاہرہ جانے والا ہو تو اس میں لے چلو کراچی جانے والا ہو تو اور اچھا ہے۔

بولا: جی کراچی تو پتہ نہیں، قاہرہ اب پرسوں جائے گا جہاز۔ جلدی کیجئے شہر کی بس چھوٹنے والی ہے۔ دس شلنگ عنایت فرمایئے۔ ڈانکے شرن شکریہ!

اس قسم کی ہم پر چوٹ پڑے تو ہماری نیند تو بے شک حرام ہو جاتی ہے۔ اور کوئی خاص پروا ہم نہیں کرتے۔ چنانچہ ہوٹل میں فروکش ہوتے ہی ہم نے مولوی محبوب عالم کا سفرنامہ نکال لیا۔ اتنے میں منیجر صاحب نے فون کیا کہ آپ ویانا کا شبینہ ٹور لیں گے؟ آٹھ بجے شروع ہوگا۔ مزے کا ہے۔ بس جگہ جگہ گھمائے گی۔ ریستورانوں میں۔ باغوں میں رقص گاہوں میں اور آخر

www.pakistanipoint.com

میں ایک عریاں کلب میں بھی لے جائے گی۔ وائن یعنی شراب کا بھی انتظام ہے۔

''پورک یعنی سور کے گوشت کا بھی؟'' ہم نے پوچھا۔

بولے: ''جی ہاں''۔

ہم نے کہا ''یہ انتظام ہوٹل کی طرف سے ہے؟ یعنی ہمارے کرائے میں شامل ہے''

منیجر صاحب نے کہا: ''جی ٹکٹ آپ کو یہیں سے مل جائے گا۔ آپ کے بل میں ہم لگا دیں گے۔ دو سو شلنگ کا ہے''۔

ہم نے کہا: ہمیں پریشان مت کرو۔ ہمیں نیند آ رہی ہے اور پورک ہم نہیں کھاتے۔''

یہ کہہ کر ہم پھر سفرنامے میں جُٹ گئے۔

معلوم ہوا کہ اے اللہ کے بندے اگر تجھے ویانا دیکھنا ہے تو مہینہ بھر ورنہ ہفتے دو ہفتے کو یہاں ٹھہر۔ میوزیم، لائبریریاں، محل، اوپرا، تھیٹر، باغ، کوچے بازار۔ آج بے شک آسٹریا کو لوگ سیاسی طور پر شمار میں نہ لائیں لیکن ایک زمانے میں تو یہ غالباً یورپ کی سب سے بڑی سلطنت تھی۔ یہ چیکوسلوویکیہ ہنگری، جرمنی وغیرہ سب زیر نگین تھے۔ ویانا یورپ کا قلب تھا۔ آج سے تین چار صدی پہلے تو جب ترکوں کا اقبال آسمان پر چشمک زنی کرتا تھا، انہوں نے ویانا کو بھی اپنی جاگیر میں شامل کرنے کی کوشش کی تھی۔ پہلی دفعہ سلطان سلیمان ثانی نے 22 ستمبر تا 15 اکتوبر 1525ء اور دوسری بار قارمصطفی صدر اعظم ترکی نے 14 جولائی تا 12 ستمبر 1683ء ویانا کا محاصرہ رکھا۔ لیکن آسٹریا کی مدد پر اہل پولینڈ آ گئے۔ اہل سیکسنی آ گئے۔ اہل بویریا آ گئے اور اہل فرانس آ گئے۔ ان کی متحدہ قوت کے سامنے ترکوں کی ترکتاز کامیاب نہ ہو سکی۔ ورنہ؟ ورنہ کا مولوی محبوب عالم نے بھی سوچا۔ ہم نے بھی سوچا۔ یہ جو سامنے جا بجا گرجوں کے نکیلے مینار نظر آتے ہیں۔ کیا عجب یہاں سلیمانیہ اور نئی جامع کی سی مسجدوں کے گنبد ہوتے۔

آج سے ستر سال پہلے کا ہندوستان دیکھئے جہاں سے مولوی محبوب عالم آئے تھے۔ اور ستر سال پہلے کا ویانا۔ بیان کرتے ہیں کہ ہوٹلوں میں لفٹ تھے۔ ٹرامیں کچھ دخانی تھیں۔ کچھ بجلی سے چلنے والی بھی۔ جیسی آج کل ہیں۔ اخبار لاکھوں کی تعداد میں چھپتے تھے۔ مولوی صاحب نے اخبار ''ویز تاک بلاٹ'' کا کارخانہ دیکھا معلوم ہوا کہ ایک لاکھ پرچہ ہر روز چھپتا ہے اور صبح وشام دو مرتبہ شائع ہوتا ہے۔ اس کارخانہ میں ایک ہزار آدمی ملازم ہیں۔ تمام کام کلوں سے ہوتا ہے۔ سکہ کے حروف بھی لینوٹائپ کلوں کے ذریعے جوڑے جاتے ہیں۔ کئی مشینیں چھاپنے کی موجود ہیں لیکن سب سے بڑی مشین ایک گھنٹے میں 32 صفحے کے 32 ہزار اخبار چھاپ کر، کاٹ کر، اور موڑ کر رکھ دیتی ہے بلکہ شمار کرنے والی مشین بھی ساتھ لگی ہے، جو خود بخود بتلاتی جاتی ہے کہ کتنا اخبار چھپ چکا۔ یہ کارخانہ برقی طاقت سے چلتا ہے۔ مولوی صاحب نے ویانا کے عجائب گھر دیکھے۔ تھیٹر دیکھے۔ پارلیمنٹ ہاؤس دیکھا۔ پراتر کے عجائبات دیکھے کہ ایک وسیع پارک ہے جس میں تفریح کی بے شمار چیزیں ہیں اور جس میں ہمیشہ میلہ لگا رہتا ہے۔ ویانا کی خوش دل عورتوں نے ان سے چہلیں بھی کیں۔ مولوی صاحب نے چونکہ صرف گفتنی درج گزٹ کیا ہے۔ لہٰذا ان کے ردعمل کا ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لکھتے ہیں: ''پارک میں سڑک ہے دونوں طرف درخت ہیں۔ درختوں کی تمام شاخوں پر سرخ سبز اور سفید روشنی کے برقی لیمپ لگے ہیں۔ ایک بٹن دبانے سے سب لیمپ روشن ہو جاتے ہیں اور بالکل طلسمات کا باغ معلوم ہونے لگتا ہے۔ مختلف رنگوں کے باریک کاغذوں کے گول گول ٹکڑوں کی لوگ مٹھیاں بھر بھر کر ایک دوسرے پر پھینکتے ہیں۔ عموماً مرد خوب صورت عورتوں پر اور عورتیں مردوں پر۔ پہلے واقفیت اور آشنائی کی کوئی شرط نہیں۔ جس پر تمہارا جی چاہے پھینکو۔ کوئی دادفریاد نہیں بلکہ سب لوگ خوش ہوتے ہیں۔ زمین پر دو انگل موٹا فرش ان کاغذی پھولوں کا ہو جاتا ہے۔ ایک دو عورتوں نے مجھ پر بھی پھینکے۔ جب میں نے جواب نہ

دیا تو ایک کم بخت نے پشت کی طرف سے میرے کالر کو اٹھا کر ایک مٹھی اس میں پھینک دی جو میں نے مکان پر جا کر نکالی۔ معلوم ہوا۔ اس ذریعہ سے بعض عورتیں مردوں سے آشنائی پیدا کرتی ہیں۔ یہ ایک پرستان کا نظارہ تھا۔ سچ یہ ہے کہ انسان ان کے آسیب سے مشکل سے بچ سکتا تھا۔ ہاروت و ماروت کی آزمائش کا قصہ اگر صحیح ہے تو وہ معذور تھے۔"

لیکن میاں انشا کو تو بس دو روز یہاں ٹھہرنا تھا اور ان کے پونڈ ڈی ویلیو ہو گئے تھے اور یہ موسم سردیوں کا تھا اور یہ حسینائیں مہ جبینائیں جانے کہاں تھیں اچھا تو کل پراتر کی سیر بھی کریں گے۔ آج ہم نے جی کڑا کر کے شہر کا ٹور لے ہی لیا۔ ستر شلنگ پیسہ تو ہاتھ کی میل ہے۔ ہم نے تو آج تک اس کی کبھی پروانہ کی۔

بس اوپر اہاؤس سے چلی۔ گائیڈ نے کتھا باچنی شروع کی۔ یہ رِنگ ہے یعنی یہاں کی سرکلر روڈ۔ اِدھر باغ عامہ ہے۔ یہ ادھر آرٹ کا عجائب گھر ہے (اس میں بھی نہیں لے کر گیا) اور یہ بیچوں بیچ ملکہ ماریا تھریسا کا مجسمہ ہے۔ اور اب صاحبو! وہ دیکھو پارلیمنٹ کا ایوان۔ اچھا تو اب ہم قصر حکومت کے سامنے آ گئے۔ اس میں پریسیڈنٹ رہتا ہے۔ صدر ڈولفس بھی 1936ء میں اس عمارت میں قتل ہوا تھا۔ یہ قیصر گرفت KAISERGRUFT ہے۔ اس کے اندر چلتے ہیں کیونکہ اس میں بادشاہوں کے تابوت رکھے ہیں۔ یہ فرنز جوزف کا تابوت ہے یہ ملکہ ماریا تھریسا کا۔ یہ فلاں بادشاہ کا۔ یہ فلاں ولی عہد کا۔ اور اب چلو باہر یہ پرانا گرجا بھی دیکھو۔ یہ مشہور سڑک ہے۔ میریا فر سٹر اس شاپنگ کے لئے بہترین جگہ (ہم نے فوراً نام نوٹ کر لیا کہ کوئی یہاں آئے گا تو اسے لکھوا دیں گے یہاں خریداری کرے) اور اب صاحبو یہ سامنے مشہور برن پیلس ہے۔ شاہانِ آسٹریا کا محل جس کی تعمیر میں 55 برس لگے۔ اس میں چودہ سو کمرے ہیں اور ایک سو چالیس باورچی خانے ہیں" ہمیں اس وقت بھوک لگ رہی تھی۔ ہم نے پوچھا۔ اتنے

www.pakistanipoint.com

ملکہ عالیہ مہریا تھریسا

www.pdfbooksfree.pk

سارے باورچی خانوں میں کیا کیا پکتا تھا۔لیکن وہ گائیڈ ہمیں تفصیلات نہ بتا سکا۔آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گیا۔ یہ محل ورسائی کی نقل تھا۔گائیڈ نے جو یہ حوالہ دیا تو اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے۔ہمیں فوراً اپنے چھیاسٹھ فرانک پیرس والے یاد آ گئے۔ اب اس کے کمروں کی سیر شروع ہوئی۔یہ خواب گاہ۔یہ بیٹھک یہ دربار گاہ۔یہ رقص کا ہال۔ سب ایک سے ایک بڑھ کر۔سب میں تصویریں۔یہ ملکہ تھریسا ہیں۔یہ ان کے باپ کی تصویر ہے یہ ان کا بیٹا ہے۔یہ ان کی بیٹیوں کی تصویریں ہیں۔

ہم نے کہا: ماشاءاللہ کتنی اولاد تھی ملکہ عالیہ کی۔معلوم ہوا سولہ۔گیارہ ان میں لڑکیاں تھیں اور پانچ لڑکے۔ایک اور عورت کی تصویر لگی تھی ہم نے کہا یہ کون ہے۔بولیں یہ ان کی بیٹی ہے۔ اس کی اٹھارہ اولادیں تھیں۔ہم نے کہا ماشاءاللہ۔فیملی پلاننگ کا محکمہ نہیں تھا ان دنوں کیا؟

یہاں شاید ابھی تک اس کا رواج نہیں کیونکہ گائیڈ نے پوچھا۔فیملی پلاننگ کیا ہوتی ہے؟ ویسے ملکہ عالیہ کے یہ اولاد خوب کام آئی۔سب کی شادیاں زبردستی کر کے یورپ کے تاجداروں سے کیں۔فرانس کا بادشاہ، اسپین کا بادشاہ، اٹلی کا بادشاہ، یہاں کا بادشاہ وہاں کا بادشاہ۔سب کو فرزندی میں لے کر بغیر تلوار چلائے اور خون بہائے سارے یورپ کی ملکہ بن گئیں۔گویا ہمارے کروڑ پتی کارخانہ دار جو دوسرے کارخانہ داروں کو اپنی بیٹیاں بیاہتے ہیں۔یہ نسخہ کوئی نیا نہیں۔انہوں نے ملکہ ماریا تھریسا سے لیا ہے۔

ایک سڑک پر سے گزرتے ہوئے گائیڈ نے کہا تھا۔یہ موتسارٹ MOZART کا مجسمہ ہے اور اب شون برس پلیس میں بھی کئی تصویریں انہوں نے بتائیں کہ یہ موتسارٹ کا مجسمہ ہے اور اب شون برس پیلس میں بھی کئی تصویریں انہوں نے بتائیں کہ یہ موتسارٹ ہے پانچ برس کی عمر میں۔یہ پندرہ برس کی عمر میں۔آخر ہم نے کہا کون تھا موتسارٹ یہ بھی تو بتاؤ۔

تب پتہ چلا کہ بیتھوون کی طرح کا کوئی گویا تھا۔یورپ میں ہم نے جا بجا موتسارٹ

بیتھوون۔ باخ۔شوبرٹ وغیرہ کے مجسمے اور ان کے نام کی سڑکیں دیکھیں جس سے قیاس ہوتا ہے کہ ہر چند اس وقت ریڈیو پاکستان کی شاخیں یورپ میں نہ تھیں، نہ فلم کمپنیاں تھیں لیکن گانے بجانے والے بھوکے نہیں مرتے تھے۔کلاونتوا کی خاصی قدر تھی۔

اور پھر اس گائیڈ کے بچے نے شون برن پیلس سے لوٹا کر گاڑی پھر اوپرا سامنے لا کھڑی کی اور کہا صاحبان یہ ٹور ختم۔آپ کا بہت بہت شکریہ۔امید ہے کہ ویانا میں آپ کا قیام خوشگوار گزرے گا۔

یہ کہہ کر وہ ٹپ لینے کے لئے بس کا دروازہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

ہم نے کہا۔"میاں پراتر تو تم نے دکھایا ہی نہیں۔وہ کاغذی پھولوں کی مٹھیاں پھینکنے والی پری جمال عورتیں کہاں ہیں تمہارے خیال میں ہمیں کچھ پتہ ہی نہیں؟"

بولا: پراتر کا ٹور 2½ بجے شروع ہوگا۔اس میں دریائے ڈینیوب بھی دکھائیں گے۔ اس کا ٹکٹ بھی ستر شلنگ ہے۔دوں آپ کو؟

پردیس کا معاملہ تھا اور کوئی تھانیدار یہاں ہمارا جاننے والا نہیں تھا۔نہ ہوا کراچی۔

www.pakistanipoint.com

قاہرہ

22 نومبر تا 28 نومبر 1967ء

www.pakistanipoint.com

www.pakistanipoint.com

دِکھلایئے لے جا کے تجھے مصر کا بازار

''مطعم مستنصر۔ خندق ابوصفین۔ شارع سلامہ، صالون عفیفی، حلوانی الاخلاص میدان التحریر۔''

ہم نے ٹھٹک کر اپنے کو غور سے دیکھا اور پوچھا، یا شیخ تیرا نام عبدالعزیز خالد تو نہیں ہے؟''

جواب ملا ''نہیں''

''ضیاء الحسن موسوی''

اس کا جواب بھی نفی میں ملا تو ہم نے نہایت تاسف سے کہا لو بھئی۔ بھیجنے والوں نے غلط آدمی بھیج دیا یہاں۔ اے شخص تو کیا لینے آیا ہے قاہرہ؟

قصہ غلط آدمی کا راویانِ رطب اللسان یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک میاں دہقانی کو قریب شام ایک اجنبی مسافر رستے میں مل گیا۔ اسے وہ اپنے ساتھ لے آئے۔ کھلا پلا کر اپنے ہی کمرے میں (اگر دہقانی کے مکان میں ایک سے زیادہ کمرے ہوتے ہیں تو) سلایا۔ دہقانی میاں کو اگلی صبح تڑکے ہی ایک کام سے دوسرے گاؤں میں جانا تھا۔ لہٰذا انہوں نے اپنی ماں سے کہا: ''ماں ماں! کل صبح مجھے بڑے تڑکے اٹھا دیجیو۔ اور ہاں مہمان کو صبح اچھا ناشتہ دینے کے بعد رخصت کیجیو،

ماں نے کہا: ''اچھا بیٹا''

ماں نے تڑکے ہی ہانک لگا دی۔ دہقانی میاں نے جانے کی وحشت میں اپنی بجائے

مسافر کا پاجامہ پہن گیا۔ (اگر دہقانی پاجامے پہنا کرتے ہیں تو) گھر سے دو کوس دور گئے ہوں گے کہ اجالا ہوا اور ان کی نظر یک لخت اپنی ٹانگوں پر پڑی۔ وہاں اجنبی کا دھاری دار پاجامہ نظر آیا۔ تو بول اٹھے۔

''میری ماں بھی کتنی بے وقوف ہے۔ اٹھانا تھا مجھے۔ اٹھا کے بھیج دیا مسافر کو''

اس روز صبح ہم ڈینیوب کے ساحل پر گھومتے پائے گئے اور شام ہمیں نیل کے کنارے ہوئی۔

ویانا میں آخری دن، یورپ میں ہمارا آخری دن تھا اور کڑاکے کی سردی کا بھی۔ صبح اٹھے تو باوجود اپنے اوورکوٹ کے کہ دمِ تحریر ناحقِ کا جھول معلوم ہوتا ہے، ٹھٹھر کر رہ گئے اور دستانے لینے بھاگے۔ کنٹوپ کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ سڑک اور گھاس سب سفید ہو رہی تھی، برف تھی یا پالا، کہہ نہیں سکتے۔ ہمارے پاس اب صرف آدھا دن تھا اس میں فوکر کنڈے میوزیم بھی دیکھنا تھا اور پراتر کی تفریح گاہ بھی۔ پھر نیلے ڈینیوب کی زیارت بھی کرنی تھی۔ میوزیم کوئی دس بجے کھلتا تھا۔ لہٰذا ہم نے اوپرا کے سامنے سے BK ٹرام پکڑی اور پراتر کی طرف سدھارے۔ صبح اور سردی کی صبح۔ وہاں اس وقت کیا دھرا تھا۔ پراتر کے سارے مزے تو مولوی محبوب عالم لوٹ کے لے گئے تھے۔ ہاں نیلے ڈینیوب سے ہم نے دعا سلام کر لی اور چلے سوئے فوکر کنڈے میوزیم۔ دیس دیس کے رہن سہن کے عجائب گھر۔ مولوی محبوب عالم لکھتے ہیں:۔

''اس میں ہندوستان کی دیہاتی زندگی کا نقشہ چند کاشت کاروں کے بُت بنا کر دکھایا گیا ہے۔ یہ بنگال کے مزارع تھے۔ سیاہ فام اور بالکل برہنہ تن۔ ان کے پاس چھپر کا ایک جھونپڑا تھا۔ اگر ان کو دیکھ کر یہاں کے لوگ سب ہندوستانیوں کو ایسا ہی سمجھ لیں تو ان کا کچھ قصور نہیں۔ چنانچہ جب میں عجائب گاہ سے نکلا تو دربان نے میرے گائیڈ سے پوچھا کہ ان کپڑوں کو جو میں اس وقت پہنے ہوئے تھا۔ وطن میں جا کر کیا کروں گا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ہندوستان جا کر میں سب کپڑے اتار کر پھینک دونگا اور جب میں نے اپنی نوٹ بک میں کچھ

اندراج کیا تو اسے یہ معلوم کر کے بہت تعجب ہوا کہ ہندوستانی لکھنا پڑھنا بھی جانتے ہیں۔

لیکن ہم ہمہ تن اشتیاق اس عجائب گھر کے دروازے پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ آج بند رہے گا۔ ہم نے ایک اہلکار سے کہا ''اے ظالم۔ ہم تو ویانا آئے ہی اس میوزیم کے لئے ہیں۔ کھول اسے! لیکن بے کار۔ اس نے کہا۔ یہ تو بند ہے اور یہ سامنے والا ہسٹری میوزیم بھی آج بروز منگل بند رہے گا۔ آپ پکچر گیلری دیکھ لیجئے۔ ہر چند کہ یورپ میں مصوری کے شاہکار دیکھ دیکھ کر ہمارا سینہ آرٹ کے رموز سے بے طرح مملو ہو چکا تھا۔ تاہم مجبوراً وہاں گئے اور جب گئے تو تصویریں بھی دیکھیں اور کچھ کو پسند بھی کیا۔ خاص طور پر سولہویں صدی کے مشہور مصور بروگل کی تصویروں کو۔ جنیوا میں ہمیں ہوڈلر پسند آئے تھے۔ لوسرن میں پینو راما کا کینوس دیکھ کر ہم مبہوت رہ گئے اور یہاں بروگل نے جو کہ جزئیت کا بادشاہ ہے ایک چوک کا نقشہ کھینچ رکھا تھا جس میں ہانک لگا کر مچھلی اور روئی بیچنے والے، اپاہج، بھک منگے بے فکرے سبھی کو اس خوبی سے سمویا ہے کہ بس.....

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

لیکن یہ ہم کیا تفصیل لے کر بیٹھ گئے۔ آپ کو اس سے کیا دلچسپی، یہ موضوع تو ہم ایسے فنونِ لطیفہ کے مبصروں کا ہے۔

ویانا سے استنبول اور استنبول میں آدھ گھنٹہ ٹھیکی لے کر قاہرہ۔ ساٹھ پینسٹھ نشستوں کے، کے ایل ایم جہاز میں ہم کل پانچ آدمی تھے۔ قاہرہ کے ہوائی اڈے پر شام کے پونے نو بجے اترے تو وہاں قلی تو بے شمار تھے۔ کسی مسافر کا نام ونشان تک نہ تھا۔ کسٹم والوں نے اور پاسپورٹ والوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ پوچھ گچھ کیا معنی، ان کا بس چلتا تو ہمارے گلے میں ہار ڈالتے۔ بنک کے ایکس چینج کونٹر پر ہم نے بے نیازی سے پانچ پونڈ کا نوٹ پھینکا اور کہا فی الحال ایک پونڈ کے مصری سکے دے دو۔ خزانچی بولا۔ جناب میرے پاس واپس کرنے کو چار پونڈ کہاں ہیں؟ آخر ہم نے بٹوے کی خوب سی جیب تلاشی لے کر دو ڈالر برآمد کئے۔ ایک اور پاکستانی مسافر سید آفتاب احمد کینیڈا سے آتے ہوئے دو دن کو یہاں اترے تھے۔

انہوں نے ایک ڈالر بھنایا۔ باقی مسافر شاید مصری تھے۔

یا تو یورپ میں یہ عالم تھا کہ ہم اپنے سامان کے چاروں نگ خود اٹھا کر بس تک لائے تھے۔ کیونکہ ہوٹل کانگریس میں دس فیصد سروس چارج تو ضرور لئے جاتے تھے لیکن دربان یا حمال قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔ یہاں دیکھا کہ پانچ آدمی صرف ہمارے سامان کے لئے لپکے۔ ایک سوٹ کیس، ایک نے اٹھایا۔ دوسرا دوسرے نے۔ تیسرے نے ہمارے شیو کے سامان کا تھیلا تھاما۔ چوتھے نے ہمارے ہاتھ سے ہمارا بریف کیس چھین لیا۔ اب ہمارے پاس فقط لندن ٹائمز کا اس روز کا پرچہ رہ گیا تھا، سو اسے پانچویں آدمی نے لے لیا۔ اور سلام کیا کہ ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں۔ اور پھر ان بھلے مانسوں نے آدھے راستے میں یعنی ہماری کار سے کوئی دس گز کے فاصلے پر ان چیزوں کو رکھ دیا۔ وہاں سے دوسرے آدمیوں کی ڈیوٹی شروع ہو جاتی تھی، وہاں ہم نے صرف تین آدمیوں کی خدمات حاصل کیں چوتھے کو کوئی سامان نہ ملا تو اس نے دوڑ کر ہماری کار کا دروازہ کھولا اور بتیسی نکال دی۔ ہمارے جی کو قاہرہ پہنچ کر عجب طمانیت سی محسوس ہوئی جیسے اپنے گھر آ گئے ہوں، تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ ایک بستی سے اذان کی آواز آئی جس سے ہماری آنکھوں میں آنسو سے آ گئے۔ یہ کار یونیسکو کے دفتر نے ہمارے لئے بھیجی تھی لیکن ہمارے ہم سفر پاکستانی کو جس دوست کے ہاں ٹھہرنا تھا وہ انہیں لینے نہ آئے تھے لہٰذا ہم نے کہا بیٹھئے، پہلے آپ کو شریف پاشا الکبیر میں پہنچا دوں۔ ہمیں ہوٹل پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ یہ بہت اچھا ہوا کیونکہ ہم ان کوچہ و بازار کو نہ دیکھ لیتے تو اصل قاہرہ سے دور رہتے۔ ٹخنوں تک پہنچتے ہوئے لانبے چوغے۔ سر پر ٹپکے۔ کھڑکھڑاتی بسیں اور ٹرامیں حمامچی، کبابچی، حلوائی، نانبائی، کلچے بیچنے والے، شوربہ فروش۔ گلیوں کے کونے کے چائے خانوں میں گپ مارتے، تاش کھیلتے، نردیں پیٹتے ہوئے لوگ۔ ٹریفک سگنل کی لال روشنیوں کو دھتا بتاتے ہوئے ایک بڑھیا بازار میں اپنا گدھا لئے کھڑی تھی۔ اس پر سنگترے لدے تھے۔ بچے ننگے پاؤں، ننگے سر دھاریدار عبائیں پہنے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے.....

www.pakistanipoint.com

تو گویا یہ تھا قاہرہ۔ ہوٹل گارڈن سٹی میں کمرہ نمبر 42 کا دریچہ ہم نے کھولا تو عین سامنے دریائے نیل لہراتا نظر آیا۔ ہمارا دریچہ عین قصر النیل یعنی دریائے نیل کے بڑے پل پر کھلتا ہے۔ ہم نے اوور کوٹ اتارا اور اسے تہہ کر کے سوٹ کیس میں سارے کپڑوں کے نیچے رکھ دیا۔ تو نے انگلستان سے آسٹریا تک ہماری خدمت کی ہے اب آرام کر، ہم بھی تو تجھے اپنے کاندھے پر اٹھائے پھرے ہیں، جان سے لگائے رہے ہیں جیب میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ جو رقم ہوائی اڈے پر بھنائی تھی۔ قریب قریب ساری مزدوری اور بخشیش میں ٹھکانے لگ چکی۔ نیچے ہوٹل کے کونٹر پر جس لحیم شحیم بیرے یا دربان نے ہمیں اہلاً وسہلاً کہا تھا وہ بھی کم از کم پانچ پیاسٹر کا حق دار تھا۔ لیکن جب ہم نے پچیس پیاسٹر کا نوٹ اسے دیا کہ اس کی ریزگاری ہمیں دو تو اس کے پاس سے بمشکل آٹھ نو پیاسٹر نکلے۔ باقی کے عوض اس نے ایک زناٹے کا سلام اور تھینک یو ہمارے حوالے کئے۔

لیکن اب ہم مشرق میں تھے اپنے گھر میں تھے، شراب پینے اور سؤر کھانے والے کافروں سے دور۔ ہمارا جی بہت ہلکا اور کشادہ ہو رہا تھا، بالکنی میں نکل کر بیت کی کرسی پر بیٹھے اور ایک لمبا سانس لیا۔ اتنے میں ایک دستک دروازے پر ہوئی۔ یہ کوئی دوسرا چوغہ پوش بیرا تھا۔ بولا۔ جناب بیئر لاؤں، ہم نے کہا۔ نہیں بابا معاف کرو۔ بولا وہسکی بھی ہے۔ ہم نے کہا۔ ہشت، اور وہ اپنی عبا لہراتا ہوا بھاگا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے ایک کاغذ چپکا ہوا دیکھا۔ جس پر ہوٹل کے ریٹ لکھے تھے:

ناشتہ	15 پیاسٹر	لنچ	45 پیاسٹر
سینڈوچ پنیر کے	5 پیاسٹر	سینڈوچ سؤر کے	8 پیاسٹر

ہم سنگ اٹھانے کو تھے کہ سر یاد آیا۔ کیا عجب ہمارے ملک کے ان ہوٹلوں میں بھی جو ٹورسٹوں کے لئے ہوتے ہیں اس قسم کا التزام ہو۔

ہمارا قاعدہ ہے کہ کسی بھی وقت پہنچیں۔ ایک چکر ہوٹل کے گرد و نواح کا ضرور کرتے ہیں اور چونکہ انسان ہیں، چوپائے نہیں ہیں، رستہ بھولتے بھی ضرور ہیں اور کبھی کبھی تو ایسا کہ

ٹیکسی والا بھی مشکل سے تلاش کر پاتا ہے اور عین اس روز ہمارے ہوٹل کے آس پاس کے گلی کوچے والوں کا حافظہ ایسا خراب ہو جاتا ہے کہ وہ ہوٹل اور سڑک کا نام سن کر منڈیا ہلا دیتے ہیں اور کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں ہم آشنا نہیں۔

رات کے دس ساڑھے دس بجے تھے لیکن ہم نکلے۔ آگے ایک بڑا چوک تھا۔ نام اس کا میدانِ تحریر۔ جی خوش ہوا کہ اس ملک میں لکھنے والوں کی اتنی قدر ہے اس کے مقابلے میں کراچی کو دیکھئے کہ ہمارے نام پر ایک بھی سڑک یا چوک نہیں بلکہ گلی کے سرے پر ہم نے جو ابنِ انشا اسٹریٹ کی تختی اپنے خرچ سے لگائی تھی وہ بھی کارپوریشن والے اتار کر لے گئے۔ ہم یہ افسوس کر رہے تھے کہ ایک آشنا صورت نظر پڑی۔ پروفیسر محمد حسن الاعظمیٰ جا رہے تھے۔ ہم نے کہا حضرت آپ کہاں؟ بڑے خلوص سے سلام دعا ہوئی اور باتوں باتوں میں انہوں نے بتایا کہ یہاں اہل علم کی قدر تو ہے لیکن میدانِ تحریر کا مطلب ہے لبریشن سکوئر۔ تحریر کا لفظ حریت کا رشتہ دار ہے۔ ہم نے کہا پھر محرر۔ چنگی محرر وغیرہ کا بھی یہی مطلب ہوا کہ آپ عمل میں آزاد ہیں، جس سے جو چاہیں وصول کریں۔ فرمایا۔ وہ بات اپنے ہاں کی ہے۔ وہ تو یہ وضاحت کر کے چلتے بنے لیکن ہم چوک کی روشنیوں میں آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔ اس چوک سے کوئی چودہ پندرہ رستے پھٹتے ہیں اور جس اونچی بلڈنگ کو ہم نے نشانی مقرر کیا تھا ویسی ہمیں دس بلڈنگیں نظر آئیں۔

ہم نے اپنی سڑک کا نام تک یاد نہ کیا تھا کہ دور تھوڑا ہی جا رہے ہیں۔ ہوٹل کا نام بتا کر پوچھا تو سب نے کہا۔ یہ نام تو ہم نے آج ہی سنا ہے۔ کہاں ہے؟ کس طرف کو ہے؟ کدھر ہے؟'' آخر ہم نے کہا لو گو۔ ہمیں دریائے نیل پر پہنچا دو۔ آگے ہم جانیں ہمارا کام۔ نیل پر پہنچے۔ وہاں سے نیل کے پل پر پہنچے۔ مشکل یہ ہے کہ ہماری کھڑکی سے تو نیل نظر آتا تھا لیکن نیل سے ہماری کھڑکی نظر نہ آئی تھی۔ آخر ایک ٹیکسی ڈرائیور نے ہماری مشکل حل کی اور دروازہ کھول کر کہا۔ اندر بیٹھئے۔ ہم بیٹھے لیکن ٹیکسی دس قدم جا کر یک لخت رُک گئی۔ ہم نے کہا یا اخی! پٹرول ڈلوا کر چلا کرو۔ یوں مسافروں کو راستے میں نہیں رکھا کرتے۔'' بولا، جی

پٹرول تو بہت ہے لیکن آپ کا ہوٹل آ گیا ہے۔

ہم نے کہا۔ یہ بات تھی تو تم انگلی کے اشارے سے بتا دیتے۔ بولا، جی انگلی سے اشارہ کرنا یہاں بدتمیزی سمجھا جاتا ہے اور پھر ٹیکسیاں کاہے کے لئے ہیں؟ آپ لوگوں کی خدمت کے لئے ہی تو ہیں۔ سات پیاسٹر۔

www.pakistanipoint.com

اہرام کے سائے میں

ہر شام جب ہم اپنی بالکنی میں سے نیل کے اس پار اور اس پار قاہرہ کی روشنیوں کا سیلاب دیکھتے ہیں تو یادوں کے ظلمات میں سے کچھ چہرے ابھرنے لگتے ہیں۔ ان روشنیوں میں شاید وہ چراغ بھی شامل ہیں جن کے بغیر پاکستان کے بے شمار گھروں میں درد کا اندھیرا ہے۔ حمید ہاشمی کا شریر چہرہ۔ خالق قریشی کی مہربان مسکراہٹ۔ ابو صالح اصلاحی پان کھاتے لطیفے کہتے۔ جعفر منصور۔ چلبلاہٹ کا بہتا دریا۔ ایم۔ بی خالد زندگی کے عزائم سے بھرپور اور خالد ضیا لودھی جس کے گھر سے ہمارے گھر کی دیوار ملی تھی..... یہ سب لوگ پی آئی اے کے طیارے سے چلے تھے لیکن پہنچے نہیں..... اے دوستو!..... اے دوستو!

اور ابوالہول کی زبانی ہم نے آج شام کے جھٹ پٹے میں یہ بنکار سنی کہ میں لازوال ہوں۔ دنیا موت سے ڈرتی ہے اور موت مجھ سے ڈرتی ہے۔ میں اور خوفو کا یہ ہرم اعظم رہتی دنیا تک کھڑے رہیں گے۔ ابوالہول کو نہ اپنی ناک نظر آتی ہے۔ نہ ہرم اعظم کا اکھڑا ہوا پلستر نہ خوفو کے تابوت کا خالی ظرف۔ سنگ وخشت اگر قائم بھی ہیں تو سنگ وخشت میں دھرا ہی کیا ہے جو موت ادھر توجہ کرے۔ کبھی خزاں نے پلاسٹک کے پھولوں کو بھی تاکا ہے۔ اسے تو تازہ اور شاداب گل پسند آتے ہیں۔ پتھر باقی ہیں اور ریت باقی ہے لیکن قوت عنخ آمون۔ ملکہ نفرتیتی۔ حسن کے تاجدار کہاں ہیں۔ عشق کے جانثار کہاں ہیں۔ جہاں بیٹھے ہم

ابوالہول کی بنکار سن رہے تھے۔ عین وہاں کھڑے ہو کر انطنی اور کلو پٹرا نے اہرام اور ابوالہول کو دیکھا ہوگا۔ یہیں سے ہیروڈوٹس نے ان پر نظر ڈالی ہوگی۔ یہیں سکندر اعظم کے دندناتے قدم پڑے ہوں گے۔ عمفس کا شہر بسا اور اجڑا۔ اور کل یہاں نپولین بونا پارٹ کھڑا تھا۔ یہ ریت اور ریت پر بنتے ہوئے مٹتے ہوئے قدموں کے نشان، ناموروں کے۔ ہم ایسے بے ناموں کے۔

شب کے اندھیرے میں اپنے آس پاس کی فضا کو ہم نے سرد آہوں سے بوجھل پایا۔ سسکیاں بھرتے سنا اور ابوالہول برابر بنکار رہا تھا..... میں لازوال ہوں میں لازوال ہوں..... یکا یک سامنے دیوار پر ایک سایہ نمودار ہوا۔ غور سے دیکھا تو ایک کتے کو پایا جو کھنڈروں میں جانے کہاں سے نکل آیا تھا۔ اس نے ٹانگ اٹھائی، ابوالہول کے مسند کی ابدیت پر پیشاب کیا اور ایک طرف کو نکل گیا۔ اپنی سال دو سال کی زندگی سے لطف اندوز ہونے کے لئے۔

روشنی اور آواز کا یہ پروگرام قریب قریب ہر شام کو ابوالہول کے مجسمے کے سامنے ہوتا ہے۔ چھپی ہوئی روشنیاں ایک ایک کر کے اہرام اور ابوالہلول کے پہلوؤں کو اجالتی ہیں اور

www.pakistanipoint.com

پس منظر سے کمنٹری ہوتی ہے۔ ایک آواز۔ پھر دوسری آواز۔ پتھر گھسیٹ کر لانے والے ہزاروں بے نام بے گاری مزدوروں کا شور سنائی دیتا ہے۔ سامنے مصری دیوتاؤں کے مندروں میں آرتی اترتی ہے۔ نئے فرعون کی تاجپوشی کا جشن ہوتا ہے۔ باجے گاجے بجتے ہیں اور اس کے بعد اس کی میت اٹھتی ہے اور ماتمی نغمہ فضا میں پھیل جاتا ہے۔ ملکہ نفریتی کا نقرئی قہقہہ گونجتا ہے۔ کاہن کی بھاری بھرکم آواز سنائی دیتی ہے۔ صدیاں جاگتی ہیں اور ہماری گھڑیوں کے دقیقوں اور ساعتوں کی طرح گزر جاتی ہیں۔ تاریخ کے پردے اٹھتے ہیں، گرتے ہیں۔ شہر بستے ہیں۔ اجڑتے ہیں۔ دریائے نیل بپھرتا ہے، سمٹتا ہے۔ کونپلیں پھوٹتی ہیں اور فصلیں کٹتی ہیں باپ اپنا ہرم بناتا ہے۔ بیٹا دوسرا ہرم بناتا ہے اور پھر غضب ناک ہجوم ان کے تابوت کھول کر ان کی لاشوں اور ممیوں کو گھسیٹ لے جاتے ہیں۔ ہم نے مصری عہدِ عتیق کے عجائب گھر بہت دیکھے، ہر جگہ دیکھے۔ لندن میں، جنیوا میں، لائیڈن میں، ویانا میں، ایمسٹرڈم میں۔ لیکن قاہرہ کے عجائب گھر کے سامنے گرد ہیں۔ یہاں جا کر ان شاہان رفتہ کی عظمت و جبروت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ فرعون خاصے باسامان لوگ تھے۔ پھر ان کے معمار، مہندس، ستارہ شناس۔ نقش گر۔ منشی، خوشنویس۔

زمانے کے سیلاب نے نیچے کی مٹی اوپر کر دی اور اوپر کی مٹی نیچے۔ اس سرزمین پر پھر یونانیوں نے قبضہ کیا۔ رومن اسے آ کر روند گئے۔ عثمانیوں کے گماشتوں نے حکومت کی۔ انگریز چھاؤنی ڈالے بیٹھے رہے۔ اور آج اسے اسرائیلیوں کے غول کا سامنا ہے۔

اہرام ہم نے تنہا جا کر دیکھے۔ جن صاحب نے ساتھ جانے کا وعدہ کیا تھا وہ ٹال گئے۔ آخر میدانِ تحریر سے آٹھ نمبر کی بس پکڑی اور سامنے جا اترے۔ ایک زمانے میں وہاں کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ اب وہاں فقط دو سیاح تھے۔ ایک ہم ایک کوئی جاپانی صاحب زادے۔ یا پھر اسکول کے لڑکوں کا ایک دستہ بیرون قاہرہ سے آیا ہوا تھا۔ اونٹوں والے اپنے اونٹ لے کر ہماری طرف بھاگے۔ گائیڈ بھی دوڑے دوڑے آئے۔ ایک نے ہمیں

www.pakistanipoint.com

سب سے پہلے آلیا اور نعرہ لگایا۔

''جاپان ویری گڈ۔ انڈیا ویری گڈ''۔

ہم نے کہا۔ ''ہم انڈین نہیں ہیں''۔

بولا۔ ''پاکستان آلسو گڈ۔ کم آن''۔

یہ نعرہ اس کا اپنا نہیں تھا۔ وہ اپنے ملک کی پالیسی بیان کر رہا تھا۔

''انڈیا ویری گڈ۔ پاکستان آلسو گڈ''۔

یہ سامنے خوفو کا ہرم ہے۔ سب سے بڑا۔ اس کی سطح چکنی نہیں ہے۔ جیسی تصویروں میں نظر آتی ہے۔ ایک کے اوپر ایک تھوڑا ہٹا کر پتھروں کا ردّار رکھتے گئے ہیں۔ بعد میں پلستر کر کے سطح ہموار کر دی گئی ہے لیکن وہ زمانے نے اکھاڑ ڈالا۔ اب تو پاؤں رکھتے ہوئے اوپر جا سکتے ہیں ہم اوپر تو خیر نہیں گئے لیکن اندر پہنچے۔ یہ راستہ جس سے اب اندر جاتے ہیں چوروں نے بنا رکھا ہے۔ جانے کس زمانے میں انہوں نے خوفو کے مقبرے کے جواہرات اور دولت چرانے کے لئے نقب لگائی ہوگی اور اس میں کامیاب رہے کیونکہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں جب پہلی فرانسیسی مہم اندر داخل ہوئی تو انہوں نے تابوت کے ڈھکنے اور لاش کو غائب پایا۔ اس چور رستے کی اونچائی فقط اتنی ہے کہ آپ جھک کر قریب قریب گھٹنوں کے بل اندر جا سکتے ہیں۔ آگے سارے رستے میں خاصی تیکھی چڑھائی ہے اور لکڑی کے تختے بچھا کر پاؤں ٹکانے کو پشتی بان لگا دیئے گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اوپر خوفو کے کمرہ تابوت میں پہنچے تو سانس چڑھ گئی تھی اور وہاں تازہ ہوا کو دخل نہیں تھا۔ سخت گرمی حبس اور ہوا کی کمی سے ہمیں اپنا دل ڈولتا محسوس ہوا۔ جی چاہا بھاگ کر باہر نکل جائیں آنکھیں اُبلی پڑ رہی تھیں۔ لیکن باہر جانا ممکن نہ تھا۔ باہر کا دروازہ آدھ فرلانگ لمبی سیڑھیوں اور سرنگ کے اس پار تھا۔ دوسرے لوگوں کے خیال سے ہم نے ارادہ مضبوط کر کے اپنے قویٰ اور اپنے سانس کو قابو میں کیا۔ ورنہ بے ہوش ہونے میں کسر نہ تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ محتاط لوگ اسی وجہ سے اندر نہیں آتے اور کمزور جسم و جان کے لوگوں کو تو وہاں آنا ویسے ہی منع ہے۔ ہم کمزور جسم و

www.pakistanipoint.com

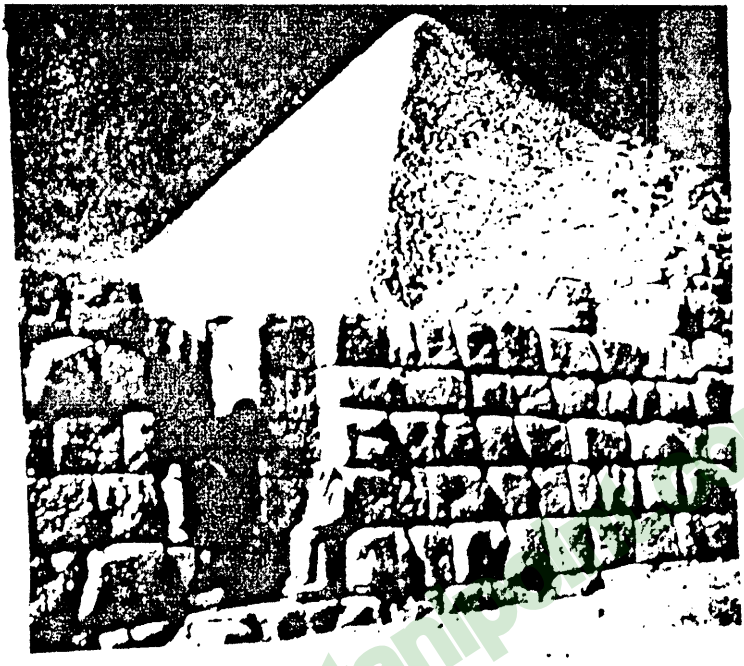

جان کے نہیں ہیں۔ لیکن غلطی یہ کی کہ سہج سہج اوپر چڑھنے کی بجائے یک دم تیزی سے اوپر چلے گئے۔ اور سانس پھلا بیٹھے۔

اس تجربے کے باوجود ہم دوسرے دونوں ہرموں کے اندر بھی جاتے اگر جا پاتے، لیکن شام کا جھٹ پٹا ہو گیا تھا۔ لہٰذا ابوالہول کی طرف جا اترے جو نشیب میں ہے اور روشنی اور آواز کا کھیل شروع ہونے تک ہلٹن والوں کے ریستوران 'خوفو' میں بیٹھے کافی پیتے، کچھ نہ کچھ کھاتے ٹھونگتے رہے۔ پروگرام کا ٹکٹ خاصا ہے تیرہ چودہ روپے لیکن ہے دیکھنے کی چیز۔

ہم نے یہاں دو مصر دیکھے پرانا مصر اور نیا مصر۔ پرانے سے مطلب فرعونوں کا مصر نہیں بلکہ ناصر سے پہلے کا۔ پرانی پود اور نئی پود۔ پرانی نسل چائے خانوں میں بیٹھی گپ کرتی اور چوسر کھیلتی اور دھوپ تاپتی۔ ہم نے تو لوگوں کو دن کے دس بجے بھی کہ ہر جگہ ہر ملک میں کام کا وقت ہوتا ہے نردیں پیٹتے، تاش کھیلتے پایا۔ یورپ میں جہاں پانچ کاموں کے لئے ایک آدمی ہوتا ہے۔ یہاں ایک کام کو پانچ آدمی کرتے ہیں، دیکھا کہ چار آدمی سڑک پر

جھاڑو دے رہے ہیں۔ پانچواں پیٹی باندھے ان کا داروغہ کھڑا ہے۔ سر بازار کھانے کی چیزوں پر گرد دھول مکھیاں سبھی کچھ ہیں۔ لوگ نان کو زمین پر رکھ دیتے ہیں اور پھر کھا لیتے ہیں۔ ڈھیلے ڈھالے ٹخنوں تک پہنچتے ہوئے گرتے، مٹی میں گھسٹتے جا رہے ہیں۔ ازہر کے آس پاس یا شریف پاشا الکبیر یا میدانِ عقبہ میں جایئے تو سارا ماحول قرونِ وسطیٰ کا ہے۔ ہمیں الف لیلیٰ یاد آئی کہ اس کے کچھ قصوں کا محل قاہرہ بھی ہے۔ کبڑا بونا بھی قاہرہ ہی میں تھا اور بوبک حجام اور اس کے سات بھائیوں کا قصبہ بھی یہیں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ہم نے بھی ایک روز یہاں بال کٹائے لیکن یہ اطمینان کر کے کہ اس شخص کو کوئی ایسی زبان نہ آتی تھی جو ہم سمجھتے ہوں۔ پھر بھی وہ بال کاٹتا گیا اور کچھ نہ کچھ قصہ کہتا گیا۔ کوئی کوئی لفظ ہماری سمجھ میں آتا بھی تھا لیکن ہم نے ہونکارا نہ بھرا۔ ہم نے انگلی کی نوک دکھا کر بتایا تھا کہ بس ہمارے بال اتنے سے چھوٹے کرنا۔ زیادہ نہ کاٹ دینا۔ اس نے اتنے رہنے دیئے باقی کاٹ کر ڈھیر کر دیئے۔ ہم نے پھر بھی اُف نہ کی اور پیسے دے کر باہر نکل آئے۔ وہ شخص ''اہلاً وسہلاً ۔۔ اسرائیل۔ ناصر۔ جہاد'' وغیرہ کرتا ہوا گلی کے موڑ تک ہمارے پیچھے آیا۔ بہت خلوص کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

اور پھر دوسرا مصر ہے نوجوانوں کا۔ ان نوجوانوں کا جو کالجوں اسکولوں میں پڑھتے ہیں اور ناصر کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ تعلیم یہاں مفت ہے اور سب کے لئے دروازے کھلے ہیں۔ تعلیم یافتگاں کو روزگار بھی لازمی طور پر ملتا ہے۔ فوجی تربیت بھی لازمی ہے۔ بڑی عمر کے لوگوں کو چھوڑ کر کوئی شخص بھی مستثنیٰ نہیں۔ ڈیڑھ سال تک اسے لازماً ٹریننگ لینی پڑتی ہے۔ دفتروں میں تیز طرار لڑکیاں کام سنبھالے ہوئے ہیں۔ کارخانوں میں مزدوروں کو کارخانے کی طرف سے دودھ ملنے کا حکم ہے۔ بڑی جائیدادیں ختم۔ بہت سے پیداواری ذرائع اب حکومت کے ہاتھ میں ہیں یا سیاسی پارٹی کی ملکیت یا امداد باہمی کے اداروں کی تحویل میں۔ یہی لوگ نئے مصر کی امید ہیں۔ اس روز صدر ناصر نے پارلیمنٹ میں تقریر کی تو ریڈیو پر بھی نشر ہوئی۔ میدان تحریر میں اور سڑکوں پر اسے سننے کے لئے لوگوں کے ٹھٹ

لگے تھے۔

اور صدر ناصر کی تقریر تھی بھی عمدہ۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں شکست نہیں ہوئی، شکست اسے کہتے ہیں جسے شکست مان لیا جائے۔ کیا ڈنکرک سے انگریزوں کے نکل جانے سے وہ جنگ عظیم ہار گئے؟ لڑائی ہتھیار کی ہتھیار سے نہیں ہوتی بلکہ عزم کی عزم سے ہوتی ہے اور ہمارا عزم ناقابلِ تسخیر ہے ہمیں کوئی ایسا فارمولا قبول نہیں جو ہمیں اسرائیل کو تسلیم کرنے پر مجبور کرے۔ ہم طاقت جمع کریں گے اور اسرائیل کو عربوں کے علاقہ سے نکالیں گے۔ جو چیز طاقت سے چھینی گئی ہے وہ طاقت ہی سے بحال کی جاسکتی ہے۔

صدر ناصر نے ان لوگوں کو بھی للکارا۔ جنہوں نے ناجائز منافعوں سے جائیدادیں بنا رکھی ہیں اور کہا سب کا محاسبہ ہوگا۔ سب کی مراعات اور استحقاق ختم۔ یہ محاسبہ صدرِ مملکت یعنی میری ذات سے شروع ہوگا۔

www.pakistanipoint.com

خان خلیل کی ایک شام

یورپ میں ہماری کم خوری اور غم خوری سب کی تلافی سردار انور خاں نے کر دی۔ سردار انور خاں کی دعوت میں خوشی خوشی جانے میں ایک نکتہ یہ تھا کہ ہم ان کو اپنی غزلیں سنا سکتے تھے۔ سارا یورپ گھوم گئے کسی نے رسماً بھی نہ پوچھا تھا کہ صاحب اپنا کلام عنایت فرمایئے۔ شاعر پر یہ وقت بڑا کڑا ہوتا ہے۔ وہ تین مہینے تک مکرر اور واہ واسبحان اللہ نہ سنے تو اس کی شاعری کا پودا مرجھانے لگتا ہے۔

بولے ''کیا کھاؤ گے؟''

ہم نے کہا ''تکہ کھائیں گے''

بولے ''تکے کو یہاں کباب کہتے ہیں''!

ہم نے کہا ''کباب بھی کھائیں گے''۔

بولے ''کباب کو یہاں کوفتہ کہتے ہیں''۔

ہم نے کہا ''کوفتہ بھی کھائیں گے''۔

اب وہ چپ ہو گئے کہ ہم نے اس کا مصری نام بتایا تو یہ اس کو بھی کھائیں گے۔ ہم نے بہت پوچھا کہ کوفتے کو یہاں کیا کہتے ہیں۔ وہ ٹال ہی گئے۔

اس شام ہم نے اتنا کھایا کہ پیدل چلنا دشوار تھا۔ وہ ہمیں ہمارے ہوٹل کے دروازے پر چھوڑ کر گئے۔ اس سے پہلے بھی ہم نے کچھ کسر نہ چھوڑی تھی۔ بیگم سجاد حیدر نے ہمیں

www.pakistanipoint.com

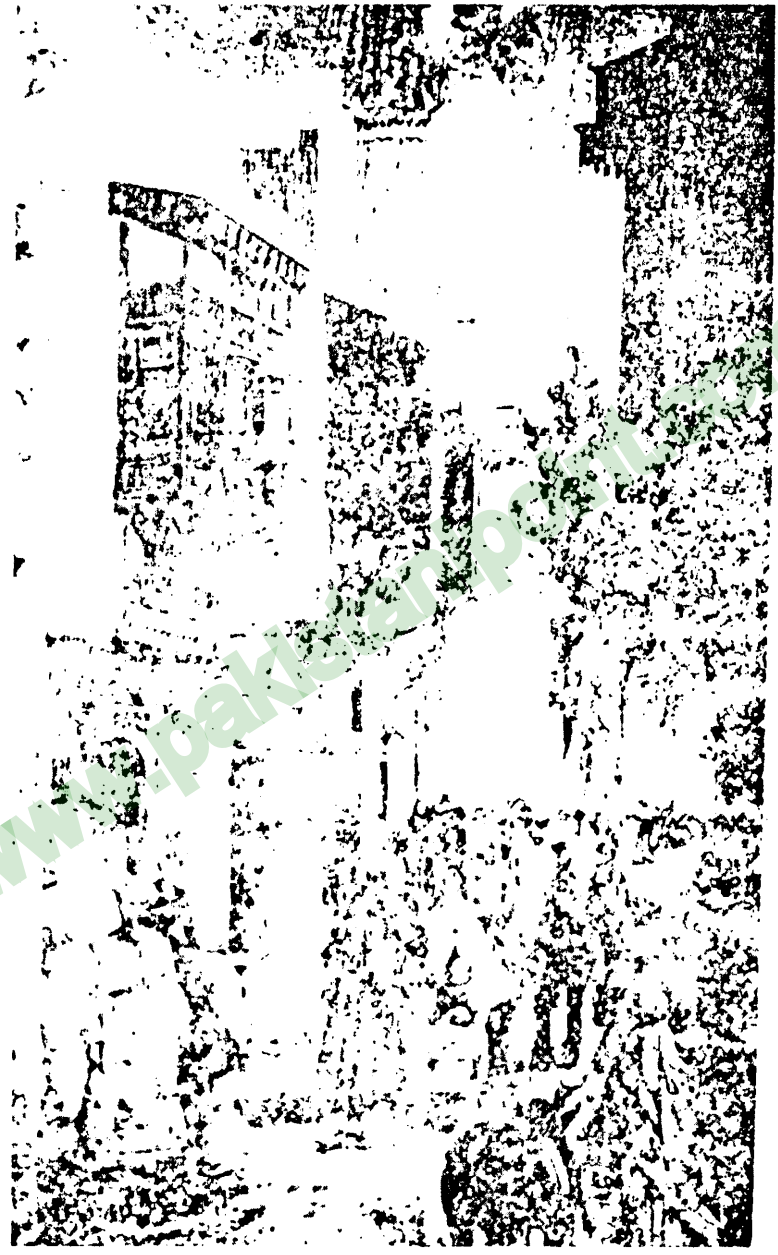

www.pakistanipoint.com

چائے پر بلایا تھا۔ وہ جنگ پڑھتی ہیں اور ادب کا بھی وسیع مطالعہ رکھتی ہیں۔ سجاد حیدر صاحب (ہمارے سفیر) بھی تشریف رکھتے تھے۔ ان سے ہم نے ذکر کیا کہ ہم بغداد جانے کا عزم رکھتے ہیں۔ فرمایا۔ وہاں تو جب جاؤ گے سو جاؤ گے۔ وہاں کی مٹھائی یہیں کھلائے دیتے ہیں۔ یہ لو یہ من وسلویٰ ہے۔

ہم نے کہا: آپ پر یہ کہاں سے اترا ہے۔

بولے: ''اترا نہیں، ایک صاحب لائے تھے۔''

ہم نے کہا: ''ہوائی جہاز سے لائے ہیں؟'' معلوم ہوا۔ ہاں۔'' ہم نے کہا تو پھر اترا ہی کہنا چاہیے''۔

من سلویٰ ہم نے منہ میں رکھا۔ اس کی اوپر کی تہہ نرم تھی۔ اندر کی بہت سخت، ہم نے کہا۔ من تو ہم کھا سکتے ہیں لیکن یہ اندر سلوا ہے کہ ڈی سلوا۔ یہ ہم سے نہیں چلتا۔ تب بیگم صاحبہ نے فرمایا۔ یہ آپ کی قسمت میں نہیں ہے تو یہ سموسے کھایئے اور سردار انور خاں کی دعوت میں جانے تک ہم آدھی درجن سموسے کھا چکے تھے۔

اور اگلے روز عبدالباری انجم نے ہمیں کبوتر کھلائے۔

عبدالباری انجم جیسا کہ ان کا نام کہے دیتا ہے۔ شاعر ہیں۔ دس بارہ برس سے قاہرہ میں مقیم ہیں۔ ریڈیو پر چیف اناؤنسر ہیں۔ ہماری آمد کا معلوم ہوا تو از راہ مہربانی ملنے آئے۔ ہم نے کہا، میاں انجم! اب ہمارا ایک دن باقی ہے۔ تمہاری یونیورسٹی الازہر ہم نے دیکھ لی۔ اہرام کو سلام کر آئے۔ لیکن صلاح الدین ایوبی کا قلعہ نہ دیکھا۔ محمد علی کی مسجد نہ دیکھی۔ کراچی کے لوگ ہم سے باز پرس کریں تو ہم کیا جواب دیں گے۔ اپنا ایک دن ہمارے ساتھ خراب کرو۔ ہم تمہارے شعر بھی سنیں گے:

www.pakistanipoint.com

''بولے بازار خاں خلیل بھی گئے آپ؟''

ہم نے کہا''ایک بار دیکھا ہے۔دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے،لیکن پہلے قلعہ و مسجد''۔

اور وہ دن اور وہ شام ہم نے پرانے قاہرہ کی گلیوں میں گزارا۔ فاطمیوں کے عہد کی مسجدیں۔مملوکوں کے عہد کی مسجدیں رفیع الشان، پر ہیبت اور پھر وہ قلعہ۔ ہاں اسی ڈیوڑھی کی اسی محراب تلے سے صلاح الدین ایوبی اپنے سمند پر سوار گزرتے ہوں گے۔ ان فصیلوں پر ان کے سرہنگوں کی نشست ہوگی، قلعے کی شکستہ در و دیوار نے افسانے کہنے شروع کئے۔سطوتِ رفتہ کے صلیبیوں سے معرکہ آرائی کے۔اور نیچے ان کے بھائی کی بنائی ہوئی مسجد ناصریہ کھڑی تھی اور پیچھے مقطم کی پہاڑیاں تھیں اور سارا قاہرہ دور تک نظر آتا تھا۔حتیٰ کہ ایک جگہ سے نیل بھی جھلکتا تھا۔

قاہرہ کی پرانی مسجدوں میں سے جامع الازہر اور سیدنا حسین d جہاں حسین d کا سر دفن ہونے کی روایت ہے۔اپنی الگ شان رکھتی ہیں۔مسجد رفاعی ان سے الگ ہے۔اس کے صحن میں چار بڑی محرابیں ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں جن میں اسلام کے چاروں مسلکوں کے مدرسے تھے لیکن قلعہ ایوبی کے اندر محمد علی کی مسجد بالکل استنبول کی مسجدوں کے نمونے کی ہے۔

محمد علی پاشا،شاہ فاروق کا پردادا ترک تھا اور عثمانیوں کی طرف سے قاہرہ کا گورنر۔لیکن پھر خود مختار ہو بیٹھا۔اس کے خدام بھی ترک تھے اور عربی نہیں جانتا تھا۔اس مسجد میں استنبول کی مسجدوں کا شکوہ نہیں لیکن نمونہ وہی ہے اور پیچھے اس کا محل۔

یہ محل کوئی بہت رفیع الشان نہیں لیکن اندر سے اچھا خاصا ہے۔محمد علی پاشا کو مملوک سرداروں کی شورش کا بہت ڈر رہتا تھا کیونکہ جس گدی پر وہ بیٹھا تھا۔وہ ایک وقت میں انہی کی تھی۔آخر ایک روز اس نے ان کی دعوت کی۔ناؤنوش کا دور چلا۔ایک طرف شادیانے

بج رہے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ مملوک سردار کھانا کھا کر ایک ایک کر کے ہاتھ دھونے کے کمرے میں جاتے تھے اور پھر واپس نہ آتے تھے کیونکہ وہاں جلاد تیغہ لئے کھڑا تھا، جو داخل ہوتا تھا۔ اس کا سر قلم ہو جاتا تھا اور کوئی آواز ہوتی بھی تھی تو باجوں اور سازوں کے شور میں دب جاتی تھی۔ تین سو آدمی تیغ کے گھاٹ اترے۔ فقط ایک بچا جو معاملہ بھانپ کر دیوار پھاند نکلا۔

اور ہم نے وہ ہال کمرہ دیکھا جس میں یہ دعوت ہوئی تھی اور وہ کمرہ دیکھا، جس میں انہوں نے جام اجل نوش کیا تھا اور محمد علی کا مومی بت صدر میں بیٹھے دیکھا جس کی دو بالشت لمبی سفید داڑھی تھی۔ اور اس کے بیٹے ابراہیم پاشا کا بت دیکھا جس نے نجد میں وہابیوں پر ستم ڈھائے تھے اور ان کی بغاوت کو کچلا تھا اور پھر اس کے پوتے شاہ فاروق کو توند نکالے چشمہ لگائے کپری کے ساحل پر ایک حسینہ سے چہل کرتے دیکھا اور پھر اس کی گمنام موت کی خبر اخبار میں پڑھی۔

بازار خان خلیل جامع الازہر اور مسجد سیدنا حسین d کے عین سامنے واقع ہے ٹیڑھی ٹیڑھی تنگ گلیوں کا گورکھ دھندا جو ادھر جمالیہ کی طرف نکل گیا ہے جمالیہ کا تعلق جمال سے نہیں بلکہ جمل یعنی اونٹ سے ہے کیونکہ مصر کی عورتوں میں ہم نے خوبصورتی کا زیادہ رواج نہیں دیکھا۔ یہاں اونٹ اور ان کے محمل اور ان کے غمزے ہوتے تھے۔ اس میں ایک بازار زیورات بنانے والوں کا ہے۔ ایک کسیروں اور ٹھیٹھروں کا ہے۔ کچھ تسبیحیں اور مسی برتن بیچنے والوں یعنی نخاس کی سی گلیاں ہیں۔ بیچ بیچ میں لوکندے یعنی ہوٹل ہیں۔ اس زمانے میں چھتے ہوئے بازار ہوتے تھے۔ قاہرہ، دمشق، اصفہان اور بغداد میں ان کی باقیات اب بھی ہیں۔ خان خلیل میں کچھ محرابیں، کچھ دروازے اور کچھ کھڑکیاں اس بازار کی

www.pakistanipoint.com

نشانی ہیں۔ اب یہاں ٹورسٹ آتے ہیں (عربی میں انہیں سیاح نہیں بلکہ سائح کہا جاتا ہے) اور حسبِ مقدور لٹتے ہیں۔ جنگ کے بعد سے ان بازاروں میں رونق نہیں رہی۔ ہم ایسا کوئی بے سروسامان بھی گزرتا ہے تو بیس دکاندار لپکتے ہیں۔ ویلکم سر۔ سوویز سر۔

میاں انجم کہ سامنے الازہر میں پڑھ کر عالم و فاضل ہوئے ہیں، قیام بھی یہیں رکھتے تھے، اس لئے بہت سے دکانداروں سے ان کے اہلاً وسہلاً اور توتڑاق کے تعلقات ہیں۔ قاہرہ کا محاورہ روزمرہ اہلِ حرفہ کی زبان سب خوب جانتے ہیں۔ دکاندار ان کی وساطت سے ہمیں ادھار تک دینے پر آمادہ تھے لیکن ہم تحریص میں نہ آئے اور بھرے پُرے بازاروں سے بیگانہ وار گزر گئے۔ سیدنا حسین سے اُدھر کو اس بازار میں داخل ہوں تو ایک پرانے زمانے کا بڈھا دہنے ہاتھ کی دوسری دکان میں بیٹھا ملے گا۔ نسوار فروش ہے۔ اور اس کی کائنات چند زنگ آلود ڈبے ہیں۔ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ان ڈبوں کی طرف منہ کیے تسبیح پڑھتا رہتا ہے۔ ہم کئی بار خاص اسے دیکھنے کو ادھر سے گزرے۔ وہاں کسی خریدار کو رُکتے نہ دیکھا۔ اس نے ہماری طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ پھر چراغ جلے اور ساری دکانوں پر روشنیاں ہوئیں۔ اس کی دکان پر روشنی بھی نہ ہوئی۔ ہم نے قریب جا کر دیکھا تو الف لیلہ کے اس کردار کو اسی طرح میلے کپڑوں میں سامنے نظریں ٹکائے تسبیح کرتے پایا۔

انجم صاحب بولے: دیکھ لیا بازارِ خان خلیل؟

ہم نے کہا: ہاں۔ اب تو فاختہ اڑنے بلکہ فاختہ کھانے کو جی چاہتا ہے کیونکہ بھوک لگی ہے۔

بولے: فاختہ تو نہیں، کبوتر ملیں گے۔ ادھر آؤ عین الازہر کے سامنے سڑک کی نکڑ پر بیٹھیں گے۔ کبوتر کھاؤ اور بازار کی سیر دیکھو"۔

اور اس نکڑ کی دوکان کے سامنے باہر کرسیوں پر بیٹھے کبوتر کھاتے ہم نے قاہرہ کی آخری

جھلکیاں دیکھیں کیونکہ اگلی صبح ہماری رخصت کی صبح تھی۔ لوگ باگ آتے جاتے ہوئے چہلیں کرتے ہوئے۔۔۔ وہ ماچس بیچتا ہوا بڈھا جس کی ایک بھی ماچس ہمارے سامنے تو بکی نہیں۔ وہ شخص جس نے اپنے گدھے پر مولیاں بار کئے ہوئے کئی بار اس گلی کے چکر کئے۔ آخری بار تو صرف دو گچھے رہ گئے تھے۔ ایک موٹی حسینہ دکانداروں سے ٹھٹھول کرتی اور ہمیں آنکھ مارتی، اپنا لانبا کُرتا گھسیٹتی چلی گئی اور شب کے سائے گہرے ہوتے گئے۔

آپ قاہرہ جایئے تو ہماری طرف سے اس بڈھے کو ضرور دیکھئے کہ نسوار کی دکان پر بیٹھا جانے کب سے تسبیح کئے جا رہا ہے اور یہاں کبوتر کھانے کو ٹھیکی لیجئے پہچان اس کی یہ ہے کہ یہ بازار کا سب سے موٹا دکاندار ہے، دن بھر سامنے کرسی ڈالے اپنے لمبے کرتے میں بیٹھا ملے گا۔ ہمارے بیٹھے بیٹھے دس پانچ آدمی اور بھی اس کی ٹکر کے گزرے۔ حتیٰ کہ بعض صنفِ نازک کے فرد بھی۔ اب ہماری سمجھ میں آیا کہ مصری ایئر لائن، یونائیٹڈ عرب ایئر ویز کی سیٹوں کی پیٹیاں دوسری ایئر لائنوں کی نسبت دگنی تگنی لمبی کیوں ہوتی ہیں۔

www.pakistanipoint.com

لبنان و شام

29 نومبر تا 5 دسمبر 1967ء

www.pakistanipoint.com

بیروت کی باتیں

سادھوؤں، سنتوں اور ولیوں وغیرہ سے ہمیں عقیدت تو ہے لیکن اتنی بھی نہیں کہ ان کے بغیر نوالہ بھی نہ توڑ سکیں۔ لیکن یاروں کو تجھ سے حالی کیا خوش گمانیاں ہیں۔ جنیوا کے ہوٹل GERVAIS.ST یعنی ساں یروے کے بعد ہماری کوشش یہ رہی کہ لادینی یعنی سیکولر قسم کے ہوٹلوں میں رہیں۔ قاہرہ میں بھی جہاں لوگ اسلامیات کی سند لینے اور کباب تکے کھانے جاتے ہیں۔ ہمیں اطالوی عیسائیوں کے ایک ہوٹل گارڈن سٹی (جارون ستی) میں رہنا پڑا۔ اور سپاگھیٹی یعنی اطالوی سویاں کھانی پڑیں۔ بلکہ نہ کھانی پڑیں کیونکہ ہم انہیں چھری سے اپنے کانٹے پر رکھتے تو تھے لیکن وہ منہ تک کانٹا آنے سے پہلے ہی پھسل کر پھر پلیٹ میں جا رہتی تھیں۔ اب یہاں بیروت میں.....''

ہوا یہ کہ ہمیں یہاں پہنچتے ہی ہمارے میزبانوں میں سے ایک نے کہا کہ ساں بیل ہوٹل میں چلے جاؤ۔ ہم نے کہا ہم آ بیل مجھے مار کے قائل نہیں۔ ہمیں تو قاہرہ میں پروفیسر محمد حسن الاعظمی نے مشورہ دیا تھا کہ خندق سقفقور الجدید میں جانا۔ گھر کا سا آرام ملے گا۔

ہم نے پروفیسر صاحب سے کہا کہ اس نکتے پر زور نہ دیجئے۔ ہم ایسے بے شمار ہوٹلوں میں ٹھہر چکے ہیں۔ جہاں گھر کا سا آرام ملتا رہا ہے۔ یعنی دروازے میں چابی نہیں لگتی۔ بستر کی چادر کئی کئی دن نہیں بدلی جاتی۔ کوئی بیرا ہماری آواز پر کان نہیں دھرتا۔ ہمیں تو کوئی اچھا ہوٹل چاہیئے۔ گھر کا سا آرام ہوتا تو گھر سے نکلتے ہی کیوں؟ یورپ کیوں آتے؟ لیکن پروفیسر صاحب کی تاکید یہی رہی کہ اسی ہوٹل میں جانا۔ واقعی آرام دہ ہے۔ سب سے بڑا آرام تو یہی ہے کہ سستا ہے۔

www.pakistanipoint.com

پس ہوٹل ساں بیل پر ہم نے اعتراض کیا کہ اس کے نام سے چوپایوں کی بُو آتی ہے۔ ہمیں یہ نکتہ بتانے میں خاصی دیر لگی۔ اور خاصی لغت چھانٹی پڑی۔ لیکن پھر کسی نے لکھ کر بتایا کہ ساں بیل نہیں ساں بعل۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے۔ کسی لفظ میں ع یا ق یا ط ظ وغیرہ آ جائے تو ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ عربی اور اسلامی چیز ہے اسی لئے پورس کے مقابلے میں ہمارا رجحان سکندر اعظم کی طرف زیادہ رہا۔ سکندر اعظم ہی نہیں۔ ارسطو۔ افلاطون۔ بقراط۔ لطلیموس۔ فیثا غورث وغیرہ کو ہم نے ہمیشہ مسلمان ہی جانا۔ ساں پر تو ہم نے غور نہیں کیا۔ بعل کی ع پر ہم چپ ہو گئے لیکن جب ہم ہوٹل پہنچے تو معلوم ہوا یہ تو سینٹ پال کا ہوٹل ہے یعنی یہاں بھی کلیسا مرے آگے۔ اب بیٹھو اور انجیل کا جاپ کرو۔ ممکن ہے ہم سینے پر صلیب کا نشان بنا کر اس وقت بھی رخصت ہو جاتے۔ ہم ایسے گنہگاروں کا سینٹ پال جیسے برگزیدہ ولیوں سے کیا کام لیکن ایک تو ہم تھکے ہوئے تھے دوسرے عین اس کے احاطے کی دیوار کے ساتھ لائٹ ہاؤس یعنی المنارہ نظر آیا چونکہ ان دنوں ہم تقاضائے بشریت سے بہت کام لے رہے ہیں۔ یعنی راستہ فوراً بھولتے ہیں۔ اس لئے یہ نشان غنیمت معلوم ہوا۔ جہازوں کے لئے بنایا گیا ہے لیکن ہمارے بھی کام آ سکتا ہے۔ ہمارے نسیان کا حکمی علاج بے شک نہیں ہے کیونکہ جن کو ڈوبنا ہے ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں۔ تاہم خیر....

دمِ تحریر رات کے دس بجے ہیں اور ہم اپنے سوٹ کیس میں اپنی فرنچ زبان کی ڈکشنری ڈھونڈ رہے ہیں تا کہ ہاتھ منہ دھو سکیں۔ تفصیل مگس کے باغ میں جانے کی یہ ہے کہ تھوڑی دیر پہلے ہم نے دیکھا ہمارے کمرے میں تولیہ کوئی رکھا ہی نہیں گیا۔ صابن ہم اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں لیکن تولیہ تو مسز البرز کے ہوٹل تک میں ملتا تھا۔ خواہ چار گرہ کا تھا۔ یہاں تو ہم نے کمرہ بھی ایسا لیا تھا جس کے ساتھ اپنا ذاتی غسل خانہ ہے۔ اگرچہ اس میں ٹب نہیں ہے اور شیشہ اتنا اونچا لگا ہے کہ ہم جیسے خاصے اونچے آدمی کی صرف آنکھیں اس میں نظر آتی ہیں۔ شاید صرف بالوں میں کنگھا کرنے کے لئے رکھا گیا ہے تا کہ لوگ بیجا طور پر ہار سنگھار میں وقت ضائع نہ کریں۔ ایک نظریہ ہمارا یہ ہے کہ یہ کمرہ داڑھی والے پادریوں کے

www.pakistanipoint.com

لیے بنایا گیا ہے۔ہم ایسے داڑھی مونڈنے والوں کے لئے نہیں۔خیر صبح سٹول پر کھڑے ہو کر شیو کرلیں گے یا دل کے آئینے میں خود کو دیکھ لیں گے۔

ہم اطمینان سے کپڑے اتارے بیٹھے تھے۔تولیہ کے لیے ٹیلی فون اٹھایا تو نیچے سے عربی سنائی دی۔آخر پتلون پہنی کوٹ پہنا۔جوتا پہنا۔ٹائی لگائی اور نیچے ہوٹل کے دفتر میں گئے۔ہم نے کہا۔تولیہ چاہئے۔ٹاول۔

وہاں جولڑکا تھا۔بس بیٹھا رہا۔بولا تو عربی بولا۔

بیروت میں عربی چلتی ہے اور فرنچ۔عربی ہماری مذہبی زبان ہے اسے ہم دنیاوی کاموں میں لانا پسند نہیں کرتے اور فرنچ بے شک ہم بہت سی جانتے ہیں لیکن جس طرح اپنے کاغذات کو اپنے تھیلے میں اور کپڑوں کو سوٹ کیس میں رکھتے ہیں۔اس طرح اپنی فرنچ کی لیاقت کو بھی ہم نے اپنی ڈکشنری اور فرنچ بول چال کی کتاب میں رکھ چھوڑا ہے تاکہ

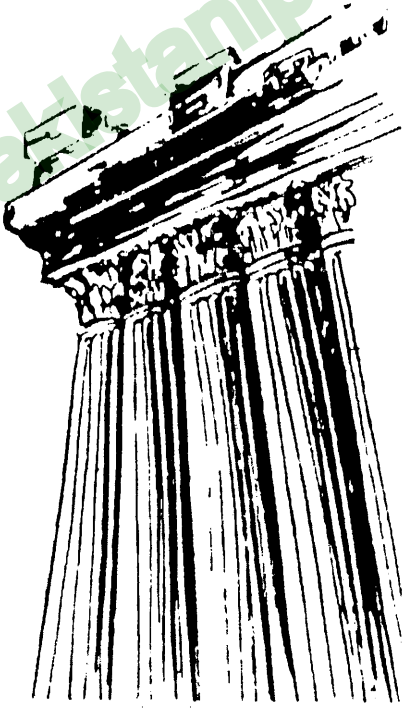

www.pakistanipoint.com

ذہن میں مختلف زبانوں کا ہجوم نہ ہو جائے اور مزید علم کے لئے اس میں گنجائش رہے۔ ہم نے لڑکے کو اشارے سے ہاتھ دھو کر دکھائے۔ اس پر وہ صابن کی ایک ٹکیہ نکال لایا۔ ہم نے کہا یہ نہیں۔ اور خیالی تولیہ سے اپنا جسم رگڑ کر دکھایا۔ شاید وہ ہمیں ورزش کا شوقین سمجھا۔ کیونکہ الماری کھول کر ڈمبلوں کی ایک جوڑی نکال کر رکھ دی۔ مایوس ہو کر ہم اوپر اپنے کمرے میں آئے۔ تھوڑی تلاش سے جرمن ڈکشنری مل گئی اور اس میں تولئے کے لئے HAND TUCH کا لفظ بھی نوٹ کر کے لے گئے کہ جرمنی آخر فرانس کا ہمسایہ ہے لیکن بے کار۔ اگر فرنچ ڈکشنری نہ ملی۔ شاید کہیں پولینڈ یا مصر میں ہم بھول آئے ہوں تو ہمارا حال قرونِ وسطیٰ کے پادریوں اور عیسائیوں کا سا ہوگا کہ نہانے دھونے کو مسلمانوں کی بدعت جانتے تھے جسم سے پسینے کی بُو آتی تھی تو بس پوڈر چھڑک لیتے تھے۔ کل بازار جائیں گے تو یا تو تولیہ خرید لائیں گے یا پوڈر کا ڈبہ۔ ان میں سے جو بھی چیز سستی ملی۔

کل رات اوپر کی سطریں لکھنے کے بعد ہم نیچے گئے تو آخر دفتر میں مونچھوں والے ایک پہلوان مل گئے جو شاید ہوٹل کے منیجر ہیں۔ تولئے کے ذکر پر لڑکے سے بولے:۔

''ابے جا! لا کے تولیہ دے صاحب کو''

وہ مسکراتا ہوا گیا اور کسی مٹکے میں سے ایک رومال سا نکال لایا۔ ہم نے کہا۔ اس سے تو

ہم ایک کلہ پونچھ لیں گے دوسرے کا کیا کریں گے۔ اس پر ایک اور رومال عنایت ہوا۔ ہم نے شکریہ ادا کر کے اور پاؤں پھیلائے اور کہا ہمیں گرم پانی بھی چاہئے شیو کرنے کو اور بندہ بشر ہے۔ کبھی نہانے کو بھی جی چاہتا ہے۔ خصوصاً جبکہ غسل خانہ کمرے کے ساتھ لگا ہو۔ اس نے کہا اس قسم کی ہمہ وقت گرم پانی ملنے کی عیاشی تو ہلٹن وغیرہ میں ہوتی ہے۔ ہم تو صبح ساڑھے سات بجے کے بعد گرم پانی نل میں چھوڑتے ہیں۔ ہم نے کہا۔ ''اچھا! آپ کی بڑی مہربانی، لیکن دیکھئے چھوڑیئے گا ضرور''۔

صبح آنکھ تو ہماری جلد کھل گئی لیکن لیٹے ساڑھے سات بجنے کا انتظار کرتے رہے۔ لبنان میں اب گرمی نہیں ہے۔ ہم اپنا موٹا سوٹ نہ پہنیں تو سردی لگتی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے یہ لوگ ابھی تک ہمارے کمرے کے نلوں کی ٹنکی میں برف کی سل ڈالتے ہیں۔ ہم نے ساڑھے سات بجے نل کھولا اور کھولے رکھا۔ کچھ فرق نہ پایا۔ آٹھ بجے کے قریب معلوم ہوتا ہے ان لوگوں نے برف نکالی اور اب خالی ٹھنڈا پانی رہ گیا۔ لیکن ہم نہانے پر تلے ہوئے تھے نہا کے رہے۔

اور یہ بھی ہم عرض کریں کہ شمع توحید کے پروانے ہونے کے باوجود یہ باقی ماندہ دن غالباً ہم ہوٹل سینٹ پال میں گزاریں گے کیونکہ آج دوپہر مسلمانوں کے ہوٹل فندق سقفقور الجدید ہو آئے ہیں۔ یہ یہاں کے ڈاؤن ٹاؤن ساحۃ الشہداء میں واقع ہے۔ ڈھونڈنے میں خاصی دیر لگی کیونکہ ہر مکان کی ہر منزل پر ایک نئے ہوٹل کا بورڈ ہے وہاں لی مارکیٹ کے نواح کا نقشہ نظر آیا۔ اتنی گندگی تو ہم برداشت کر لیتے ہیں۔ جتنی پاکستان میں ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ کی عادت نہیں۔ غسل خانے کے کمرے کے ساتھ ہونے کی بات تو دور رہی۔ وہ تو دو مسافروں کو ایک کمرے میں رکھتے ہیں تاکہ باہم محبت بڑھے۔ قدرِ عافیت معلوم کر کے ان کا کارڈ لے کر ہم آ گئے لکھا ہے۔ ''یتوفر فیہا للمسافر کل اسباب الراحۃ نظافۃ خارقہ معاملت جیدۃ۔ حمامات ضمن العرف باسعار لاتزاحم۔''

ہماری سمجھ میں اس میں سے فقط اسباب۔ راحت اور حمام وغیرہ کے لفظ آئے یعنی وہ

www.pakistanipoint.com

چیزیں جو ہم نے وہاں نہ پائیں۔

یہاں مشرق وسطیٰ میں ایک چیز البتہ ہم نے ایسی پائی کہ ہمارا وطن واپس جانے کا اشتیاق کمزور پڑ گیا ہے۔ قاہرہ اور بیروت کے لوگ جوہر شناس ہیں۔ ہر جگہ ہمارا تعارف السید ابن انشا کے نام سے ہوا۔ ہمارے ملک میں ذات پات کو لوگوں نے موروثی جاگیر بنا رکھا ہے اگر آپ سید پیدا ہوئے ہیں تو آپ کو سید مانیں گے ورنہ نہیں۔ اچھے بھلے لوگ عمر بھر موچی کے موچی رہتے ہیں۔ ہم عالم عرب سے اپنے سید ہونے کی بہت سی سندات اپنے ساتھ لا رہے ہیں کیونکہ منصفی کی جائے تو زیادہ مستند ان لوگوں کا فرمایا ہوا ہے۔ سادات کا آغاز ادھر کہیں عرب ہی میں ہوا تھا۔ ہندوستان پاکستان کے لوگوں کو اس قسم کا حکم لگانے کا کوئی حق نہیں۔ انجمن سادات امروہہ اور وظیفہ اور وظیفہ المومنین وغیرہ کو چاہیے کہ ہمارے نام کی ممبری کی پرچی کاٹ رکھیں ورنہ ہم آ کر فساد مچائیں گے۔ استغاثہ کریں گے اپنے ایسے تمام سیّدوں کو اپنے ساتھ ملا لیں گے پاکستان میں ان کی تعداد موروثی سیّدوں سے کم نہیں ہے۔

www.pakistanipoint.com

دمشق میں عشق

پہلی رمضان کی افطار ہمیں طرابلس الشام میں صلیبیوں کے قلعے اور مسجد خالد بن ولید کے آس پاس ہوئی اور دوسری رمضان کے چاند نے ہمیں دمشق کی تنگ و تاریک محرابی چھتوں والی گلیوں میں گھومتے پایا۔

یہ دن اتوار کا تھا اور بیروت میں بارش ہو رہی تھی۔ اپنی طرف سے تو ہم نے بہت جلدی کی۔ لیکن ساحتہ البرج کے ٹیکسی والے کے لئے پہلی سواری ہم تھے اور باقی چار کی تلاش میں وہ ہمیشہ غچہ دے رہا تھا کہ بس پانچ منٹ میں چلتے ہیں۔ اس تاخیر پر ہم نے جو غصہ اتارا وہ انگریزی میں تھا۔ ہمارے جی کا غبار کچھ دُھلا اور ٹیکسی والا بے مزہ بھی نہ ہوا کیونکہ وہ یہ زبان نہ جانتا تھا۔ ہم نے کئی بار ٹکٹ واپس کرنے کی کوشش کی کہ کسی دوسری ٹیکسی میں چلے جائیں لیکن یہی زبان کی دِقت حائل رہی۔ ناچار ٹیکسی والے کے ساتھ ہم نے بھی مسافر ڈھونڈنے شروع کر دیئے کسی شخص کو آتا دیکھتے تو آواز لگاتے ''دمشق'' دمشق، اے بھائی دمشق، اے میاں دمشق چلو گے؟ ایک سواری دمشق کی''۔ وہ سر ہلا کر آگے بڑھ جاتا ہمیں سخت جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی کہ دمشق اتنی اچھی جگہ ہے۔ یہ لوگ جاتے کیوں نہیں۔ یہاں کیوں گھوم رہے ہیں۔ ہم دوبارہ اپنی انگریزی کی دھار تیز کر رہے تھے کہ تین عورتیں بظاہر بارش سے بچنے کے لئے سائبان کے نیچے آ کھڑی ہوئیں ایک موٹی اور خاصی عمر کی۔ دوسری جوان، گود میں بچہ اور تیسری ایک لڑکی، جسے دیکھتے ہی ہم نے فوراً حضرت شیخ سعدی

سے کہ ہمارے غائبانہ پیرو ہی ہیں فرمائش کی کہ یہ ہماری ہم سفر ہو اور لالچ بھی دیا کہ آپ کے نام کی پانچ پیسے کی ریوڑیاں بانٹیں گے۔ ہم ایسے مستجاب الدعوات کبھی بھی نہ تھے بلکہ ہمارے معاملے میں دعا کو اثر کے ساتھ اکثر دشمنی رہی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے اس وقت باب رحمت غلطی سے کھلا رہ گیا تھا۔ یا حضرت سعدی ریوڑیوں کے پھیر میں آ گئے۔ اس لڑکی نے کہا: ''تین ٹکٹ دمشق کے''۔

یا تو ہمیں ایک لفظ عربی کا نہ آتا تھا یا پھر زبان ایسی رواں ہوئی کہ ہم راستے بھر یعنی دمشق تک مس فریال المدنی سے عربی میں باتیں کرتے گئے۔ اس کو انگریزی کے صرف دو لفظ آتے تھے۔ ''ویری نائس'' (بہت عمدہ) چنانچہ ہماری عربی پر بھی انہوں نے یہی برتے۔ بھلا ہو مولوی محمد حسن کا۔ اگر زندہ ہیں تو اللہ ان کو نوح کی عمر عطا کرے۔ ورنہ کم از کم اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ عربی پڑھاتے ہوئے ہمیں چودہ کے چودہ صیغے ایک سانس میں دہرانے پر مجبور کرتے تھے۔ آج وہ کام آئے اور چند الفاظ عربی کے۔ لا۔ نعم۔ اجل۔ جاء۔ فی۔ عن۔ شکراً۔ طیب وغیرہ نے بھی بڑی مدد دی۔ یہ شامی لڑکی تھی۔ یہ بادام سی آنکھیں اور یہ سیب کے سے گلابی گال۔ نقش موٹے موٹے تھے لیکن دلآویز اور صحت مند اور مسکراہٹ اور شیریں آواز تو ان نقوش میں عجب رنگ بھر دیتی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ بچے والی میری اخت ہے یعنی بہن۔ ہم نے کہا اور یہ بڑھیا تمہاری ماں ہو گی۔ بولیں۔ نہیں یہ میری خالہ ہیں۔ آگے چل کر ٹیکسی کو ایک گلی میں ٹھہرایا تو ایک شخص جس کے چہرے پر خشونت اور مونچھوں کی فراوانی تھی، سوار ہوا۔ یہ مس فریال کا بہنوئی تھا۔ اس کو دیکھ کر ہماری رطب اللسانی میں تھوڑا سا فرق ضرور پڑا۔ لیکن ہم نے ہتھیار نہ ڈالے۔ مس فریال دمشق میں طالب علمی کرتی تھیں۔ ہم نے کہا۔ ہم بھی طالب علمی کرتے ہیں اور کاتب ہیں۔ کاتب حضرات بُرا نہ مانیں کہ ہم خوشنویسی اور غلط نویسی سیکھے بغیر ان کی صفوں میں گھسنے کی کوشش کر

www.pakistanipoint.com

ہے ہیں۔عربی میں کاتب ادیب کو کہتے ہیں۔خواہ وہ ہم ایسا بدخط اور شکستہ خط ہی کیوں نہ
و۔عربی بولتا پا کر ان کی خالہ بھی عربی کے ٹانکے لگانے لگیں۔لیکن ہم نے ان پر کچھ اعتنا نہ
کی۔زبانِ حال سے کہا تو یہی کہا کہ چپ رہو بڑی بی۔ہمیں اتنی عربی نہیں آتی اور جو آتی
ہے وہ فریال بانو کے لئے ہے۔ہم فقط ماہ رخوں کے لئے مصوری سیکھنے والے لوگ ہیں۔

بیروت سے نکلنے کے گھنٹہ بھر بعد جبل لبنان کی چڑھائی شروع ہوگئی اور پھر تو ہم اوپر
تھے اور بادل نیچے وادی میں۔سردی بھی شروع ہوگئی تھی۔شطورہ نامی قصبے میں ٹیکسی رکی اور
یہ لوگ کہ روزہ رکھے ہوئے تھے کھانے پینے کی چیزیں پھل پھلاری وغیرہ خریدنے کے لئے
کے۔فریال نے ہم سے کہا۔آپ کچھ نہ کھائیں گے۔ہم نے کہا۔نہیں۔بولیں روزہ ہے؟
م نے کہا،ہم سفر میں ہیں،روزہ نہیں ہے۔تھوڑی دیر میں ہم بھی نکل کر دکان پر چلے گئے،
ور اپنے لئے کچھ سیب پسند کئے اور پیسے دینے کو جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس بانو نے روک دیا
کہ پیسے ہم دیں گے۔ہم نے کہا اے جانِ قیس! تو چاہے تو ہمیں بے دام خرید سکتی ہیں۔
یسوں کا تکلف نہ کر۔لیکن نہیں۔ہمیں ہے یہ سیب قبول کرنے پڑے۔

فریال کی نشست ہمارے ساتھ نہیں تھی۔ہم تو پیچھے کھڑکی کے ساتھ بیٹھے تھے ان کی
ڑھیا خالہ کے سایہ عاطفت میں۔فریال آگے کی سیٹ پر ہمارے بالمقابل اس کے ساتھ
س کا قصاب نما بہنوئی اور پھر ڈرائیور۔لیکن وہ لڑکی ایسی تھی کہ سارا وقت پیچھے کو منہ کئے بیٹھی
ہی۔بات بے بات اس ملائمت اور اپنائیت سے دیکھ لیتی تھی کہ بس۔

بولیں: کے روز رہو گے دمشق میں؟

ہم نے کہا۔اے دختر شام،ہم مسافر ہیں۔آج رات چلے جائیں گے واپس۔یا
یادہ سے زیادہ کل۔کیونکہ اب ہماری واپسی کا دن قریب آرہا ہے۔ہمارا دامنِ خیال مت
پکڑ۔اس قسم کی دلیری کا کچھ فائدہ نہیں۔لیکن وہ اس پر مُصر رہی کہ دمشق سے آج مت

www.pakistanipoint.com

جانا۔ کم از کم دو دن رہنا۔ ہم نے کہا اچھا جو حکم۔ اس کے پاس اس کی تصویریں تھیں۔ ہم نے ایک مانگی تو اس نے اپنے بہنوئی کی طرف آنکھ کا اشارہ کیا کہ اس سے خبردار۔

اور پھر دمشق آ گیا جہاں یاروں نے عشق فراموش کر دیا تھا۔ محض اس لئے کہ ذرا قحط سالی ہو گئی تھی۔

ہم دمشق کے چوک میں ٹیکسی سے اترے ہی تھے کہ ایک شخص بھاگا بھاگا آیا۔ بغداد؟ بغداد؟

ہم نے کہا: ''میاں ہم تو ابھی دمشق آئے ہیں تو ہمیں بغداد کیوں دھکیل رہا ہے۔ واں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے''۔

بولا۔ ''زیارت؟''

ہم نے کہا۔ ''لا''۔ یعنی اگر زیارت کرنی بھی ہے تو تیری ضرورت نہیں۔ ہاں ہمیں فندق عدن کا پتہ بتا دے۔

فندق عدن کا نام ہمیں پروفیسر حسن الاعظمی صاحب نے قاہرہ میں دیا تھا اور اس کے مالک ایک سیالکوٹی ہیں۔ مدت سے یہاں مقیم ہیں۔ لہٰذا عبداللہ ہندی کہلاتے ہیں۔ ہمارا ارادہ تھا کہ رات رہنی پڑی تو ان کے فندق میں رہیں گے۔ ورنہ دعا سلام تو کریں گے ہی۔ ان سے زیارت گاہوں کا پتہ مقام وغیرہ پوچھیں گے۔

اس شخص نے کہ نام تو اس کا سلیمان تھا لیکن شکل اس کی ہُدہُد کی تھی ہم سے کہا ''فندقِ عدن؟ اچھا میں بتاتا ہوں''۔

ہمارا خیال تھا وہ انگلی سے اشارہ کر کے بتا دے گا یا چند قدم چل کر ہماری رہنمائی کر دے گا۔ اور ہم شکراً کہہ کر آگے چل دیں گے۔ لیکن اس نے ہمیں آگے چلنے کا موقع ہی نہ دیا۔ ہم کافی تیز چلنے بلکہ بھاگنے والے آدمی ہیں لیکن وہ تو ہُدہُد کی طرح پھدکتا ہوا چلتا تھا۔

www.pakistanipoint.com

چوک پار کر کے ایک گلی۔ ایک سے دوسری حتیٰ کہ کوئی ڈیڑھ فرلانگ دور ہمیں لے گیا اور بولا:

''یہ رہا۔ فندق عدن۔'' باہر لکھا تھا۔ فندق قصر عدن۔''

ہم نے اندر جا کر پوچھا۔ عبداللہ ہندی صاحب ہیں؟

وہاں ایک صاحب بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور شاید شعر کہہ رہے تھے۔ بولے ''وہ تو کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ آ جائیں گے۔ آپ کو کمرہ چاہئے؟ کمرہ لے لیجئے۔

ہمارے پاس سامان تو کچھ تھا ہی نہیں۔ ہم نے کہا۔ اچھا ہم پھر آئیں گے۔ اب میاں ہُد ہُد پھر سڑک پر پھدکنے لگے۔ وہ آگے آگے ہم پیچھے پیچھے۔ ہم نے کہا..... اے حضت کدھر؟ بولا:

''جامع اموی۔ سوقِ حمیدیہ''۔

ہمیں ان جگہوں پر جانا تو تھا ہی۔ سوچا ٹھیک ہے کچھ دے دیں گے اسے۔ وقت بچے گا۔ ورنہ ہمیں بتایا گیا تھا کہ سوق حمیدیہ یعنی دمشق کا قدیم بازار یہ سامنے ہے اور جامع اموی اس کے عین پیچھے، میاں ہد ہد ہمیں بازار میں لے جانے کا زیادہ اشتیاق رکھتے تھے۔ کبھی پشمینے والی گلی میں۔ کبھی زیورات والے بازار میں۔ کبھی سوویز کی دکانوں پر۔ ہم نے کہا۔ یا شیخ ہمیں کچھ نہیں خریدنا۔ جامع اموی چل اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے مقبرے چل اور حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کی قبر پر لے چل اور مدرسہ عالیہ اور امام غزالی.....

یہ شخص بھیڑ میں ایسا طرارے بھرتا وا چلتا تھا کہ تعجب ہوتا تھا یا پھر یوں طرارے بھرتے ہم نے ایک پیر مرد ہفتاد سالہ کو قاہرہ میں دیکھا تھا جو اپنے لانبے کرتے اور سفید داڑھی اور عمامے میں سچ مچ کا نہیں بلکہ ہالی ووڈ کی کسی الف لیلیٰ کی فلم کا کردار لگتا تھا۔ ایک زقند میں بیس سیڑھیاں اتر گیا تھا۔ ہم میاں ہُد ہُد کو بار بار بریک لگاتے تھے۔ ''رفیقی

لاتسرع۔ لاتسرع۔'' یعنی میاں باندھ کے چل۔ لاتسرع (جلدی مت کر) کا لفظ ہم نے آج ہی سیکھا تھا۔ دمشق کے راستے میں ایک ٹرک ہمارے آگے آگے تھا۔ ''یا'' سامان سو برس کے ہیں کل کی خبر نہیں وغیرہ۔ مطلب ہم نے ''لاتسرع'' کا اس لئے نکال لیا کہ اس وقت ہمیں عربی آ رہی تھی۔ ہم مس فریال سے گفتگو جو کر رہے تھے۔ اب رہی سہی میاں ہدہد پر صرف ہو رہی تھی۔

اور آخر پہلے شکستہ محرابی دروازے نظر آئے۔ دیواریں بلا چھت کے۔ جانے یہ پرانے سوقِ حمیدیہ کی باقیات تھیں یا مسجد کا باب اوّل۔ اس کے بعد مسجد کا دروازہ۔ نعلیں کو در بغلین کیا۔ ایک شخص دوڑا دوڑا آیا۔ مسلمان؟ پاکستان؟ ہم نے جی میں تو کہا کہ میر کے دین و مذہب کو تم پوچھتے کیا ہو اس نے تو!

لیکن بظاہر یوں گویا ہوئے کہ دریں چہ شک۔ الحمدللہ۔ کیا ہم صورت سے مسلمان نہیں لگتے؟

www.pakistanipoint.com

حضرت عیسیٰؑ کا مینارہ دمشق میں

www.pakistanipoint.com

ایک شام ماضی کی محرابوں میں

''معتکف بودم بر مزارِ حضرت یحییٰ علیہ السلام در جامع دمشق''

یہ شیخ سعدی کی آواز تھی جو بچپن سے ہمارے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ان الفاظ سے گلستان کی ایک حکایت کا آغاز ہوتا ہے یہ مزار صحنۂ مسجد میں نہیں بلکہ عین مسجد کے اندر چھت کے نیچے ہے اور سنگِ مرمر کی جالی سے گھرا ہوا ہے اور اس پر ایک سبز گنبد ہے اور ہر چہار طرف ہمہ وقت کچھ نہ کچھ لوگ یہاں معتکف رہتے ہیں۔ ہم نے بھی یہاں چندے اعتکاف کیا۔ شیخ سعدی کے وسیلے سے شرح صدر کی دعا مانگی۔ میاں ہدہد بھی ہمارے ساتھ دوزانو ہوئے۔ خدا جانے انہوں نے کیا دعا مانگی۔ خدا جانے انہوں نے کیا دعا مانگی ہوگی۔ ممکن ہے یونہی ہاتھ اٹھائے ہوں کیونکہ انہیں ہر سیاح کے ساتھ اٹھانے پڑتے ہوں گے یا پھر یہ کہا ہوگا کہ یا مولا اس اجنبی کے دل میں آج شام سخاوت ڈال۔ اس کے ہاتھوں اور بٹوے میں برکت دے۔ اس کی دعا تو اگر اس نے یہی مانگی تھی ایک واجبی حد تک منظور ہوئی۔ ہماری دعا کا نتیجہ ابھی نکلنا باقی ہے۔

مسجد کے اندر دو تین جگہ وعظ بھی ہو رہا تھا۔ مسند پر آلتی پالتی مارے ایک بزرگ اسلام کی عظمت ماضی کا قصہ کہہ رہے تھے۔ لوگ کھڑے کچھ بیٹھے سن رہے تھے۔ بعضے اٹھ کر دوسرے واعظ کے موکلین میں جا شامل ہوتے تھے۔ جو شمالی جانب کے دروازے کے قریب بیٹھا رمضان کے فضائل بیان کر رہا تھا۔ چھت اونچی اور شاندار ہے لیکن زیادہ پرانی نہیں ہے کیونکہ اس مسجد کو ان صدیوں میں بارہا شکست و ریخت اور طوفان غارت و آتش

میں سے گزرنا پڑا ہے۔ اب ہم جنوبی جانب کے وسیع برآمدے میں نکل آئے اور جوتا پہن صحنہ مسجد میں سے گزر مشرقی دروازے کی طرف آئے۔ گویا یہاں صحن مسجد میں جوتا پہنا جا سکتا ہے۔ مسجد کے مغربی دروازے کے ساتھ امام غزالی کا مکتب تھا۔ ہم نے اپنے خضر راہ سے اس کا نشان پوچھا لیکن وہ کوئی تاریخ تھوڑی پڑھا تھا۔ اس کا کام تو اڈے سے مسافروں کو گھیر گھار کر ہوٹلوں میں پہنچانا تھا۔ صحن میں پاڑ لگ رہی تھی۔ مرمت ہو رہی تھی۔ اور بارش کی پھسلن تھی اور ہمارے جوتے چکنے فرش پر رپٹے جا رہے تھے لیکن میاں ہد ہد ہمارے لاتسرع۔ لاتسرع پر کان دھرے بنا برابر لپکے جا رہے تھے۔ مشرقی دروازے سے نکلیں تو باہر پھر اونچی شکستہ محرابیں دکھائی دیتی ہیں۔ انہوں نے ہلاکو کی یورش بھی دیکھی ہو گی۔ تیمور کی بھی۔ یہیں وہ مشرقی منارہ ہے جس پر ایک روایت کے بموجب قیامت کے روز حضرت عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے۔ بائیں ہاتھ کو مڑیئے تو سلطان صلاح الدین غازی کی تربت کا قبہ سامنے تھا۔ ایک چھوٹے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ وہاں ایک بزرگ بیٹھے قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ ایک نوجوان نے اٹھ کر دوسرا دروازہ کھولا اور سامنے اس فاتح کی آرام گاہ تھی۔ جس کے پرچم کے آگے مشرق اور مغرب سرنگوں تھے جس نے یورپ کے متحدہ لشکروں کا سامنا کیا اور اپنی فتوحات اور حسن اخلاق کی داستانیں چھوڑ گیا۔ آج جبکہ سرزمین شام کے ایک کونے اور بیت المقدس کو غاصبوں نے دبا رکھا تھا اور فلسطین کے مہاجر صحرا میں دربدر پھر رہے تھے۔ یہ فاتح لمبی تانے سو رہا تھا ہم نے کہا اے غازی! اٹھ کہ تو اب نہیں اٹھے تو کب اٹھے گا۔ کیا خوب قیامت کا بھی ہو گا کوئی دن اور؟

فاتحہ سے فارغ ہو کر ہم پھر نکلے۔ گھوم کر مغربی دروازے سے دوبارہ مسجد میں داخل ہوئے۔ اب گائیڈ صاحب باہر کھڑے رہے۔ ہم نے پھر ایک بار نگاہوں کو اس رواق کہنہ کے نظارے سے سیراب کیا۔ ایک بار پھر مزار حضرت یحییٰ پر بیٹھے اور تصور کیا کہ ہمارے شیخ حضرت سعدی علیہ الرحمۃ بھی یہیں کہیں معتکف ہوئے ہوں گے اور اس سامنے کے

دروازے سے وہ لولا لنگڑا آدمی داخل ہوا ہوگا جسے دیکھ کر شیخ اپنے پاؤں میں جوتا نہ ہونے کا غم بھول کر رب کا شکر ادا کرنے لگے کہ جوتا نہ سہی میرے پاؤں تو ہیں۔ ورنہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاؤں نہیں۔ ہم نے بھی شکر ادا کیا کہ ہوس کی تو انتہا نہیں۔ قسام ازل نے ہمیں پہلے ہی ہمارے حصے سے زیادہ دے رکھا ہے۔

باہر میاں ہد ہد اپنی لمبی چونچ نکالے ہمارے منتظر تھے ہم ایک بار پھر سوق حمیدیہ کی طرف چلے اور اس کے دروازے پر پہنچ کر ہم نے اسے کچھ دے دلا کر رخصت کیا کیونکہ ہم تو اس شہر کے در و دیوار سے باتیں کرنے آئے تھے۔ یہاں سیاحت کے تحفے لینے نہیں آئے تھے۔ ہمیں حریر اور زری کے سامان نہ خریدنے تھے۔

بڑے بازار کی چھت تو قدیم نہیں ہے اب تو اسے لوہے کی چادروں سے پاٹا گیا ہے لیکن ایک بغلی گلی میں ہمیں محرابوں کا ایک سلسلہ نظر آیا اور ہم نے اس میں غوطہ مارا۔ اس وقت شام اتر رہی تھی۔ روزہ دار اپنی دکانوں کو سمیٹنے لگے تھے اندھیری گلیوں کو زیرو نمبر کے نیلے بلب ایک آسیبی سا اجالا بخش رہے تھے۔ دہنی طرف کو ایک بڑا دروازہ نظر آیا۔ یہ مدرسہء ناصریہ تھا جس کی بنا سلطان صلاح الدین ایوبی کے بھائی سلطان ناصر الدین ایوبی نے رکھی تھی۔ آگے گلی اور تنگ ہو کر دہنی طرف کو مڑ گئی تھی دونوں طرف کی بالکنیوں کے جھروکے ایک دوسرے کو چوم رہے تھے۔ یہ پرانے جھروکے اڑ داڑوں پر قائم تھے لیکن نیچے کی ڈیوڑھیاں اور محرابیں اور طاقچے سب قدیم تھے۔ چوبی دروازے بھی عہد پاستاں کی کہانیاں کہتے تھے یہ تھا امویوں کا دمشق۔

دمشق اس وقت بھی آباد تھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دین حق کی منادی کی۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے عہد میں بھی یہ رونق پر تھا۔ آشوریوں اور ایرانیوں کے رایت بھی اس کی فصیلوں پر لہرائے اور سکندر اعظم کے بعد اہل مقدونیہ بھی یہاں اپنا سکہ چلا گئے۔ چودھویں سنہ ہجری میں خالد بن ولیدؓ کے ہمراہ عبیدہؓ بن جراح اور یزید بن

ابی سفیان کے ہاتھوں یہ فتح ہوا۔ خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کے عہد میں اس کی حکومت امیر معاویہ کے ہاتھ میں تھی اور 40ھ سے یہ امویوں کا پایہ تخت اور تمام دولِ اسلامیہ کا مرکز بن گیا لیکن یہ طرۂ امتیاز اس کی دستار میں فقط صدی بھر کو رہا۔ مصر میں خلافت عباسیہ منتقل ہونے کے بعد کبھی یہ مصر کے تابع رہا۔ کبھی بغداد کے۔ سلجوقیوں کی بعض شاخیں بھی اس پر کچھ دن حکومت کر گئیں اور پھر ہلال وصلیب کے معرکے برپا ہونے شروع ہوئے۔ یہ مدرسہ ظاہریہ ہے جس کے اندر ملک الظاہر کا مقبرہ ہے۔ یہ مدرسہ عالیہ ہے۔ جہاں ابن خلکان درس دیتے تھے یہ مدرسہ افتائیہ ہے۔ یہ مدرسہ، ڈیوڑھیاں اور محرابیں۔ محرابیں اور طاق جن میں کوڑا کرکٹ کے ڈھیر ہیں اور ڈیوڑھیاں جن میں سے اندھی اندھی گلیاں جانے کدھر نکل گئی ہیں۔ بظاہر گلی بند معلوم ہوگی۔ سامنے ایک مکان نظر آئے گا لیکن بس وہیں سے خم کھا کر کسی طرف کو نکل جائے گی اور پھر محرابوں کی بھول بھلیاں میں گم ہو جائے گی۔ کہیں چند سیڑھیاں اور پھر ڈھلوان گلی اوپر ہی اوپر۔ اور پھر یک لخت نیچے اتر جایئے۔ اس جھٹ پٹے میں ساری گلی میں بس ایک بچہ کھڑا تھا۔ بولا ''مرحبا''۔ ہم نے کہا: جیتے رہو نونہال۔ ان محرابوں کے بیچوں بیچ کولکیاں ہیں جن میں کہیں کوئی ٹین گر رہے کہیں لوہے کا کباڑی ہے کہیں کوئی درزی کپڑے سی رہا ہے کہیں آگ پر سماوار چڑھا ہے اور سامنے کلچے پھیلے ہیں۔ ایک جگہ بغیر چراغ جلائے اندھیرے ہی میں ایک بڈھا موچی اپنے یا کسی اور کے جوتے میں کیلیں ٹھونک رہا تھا۔ اب روزہ کھل گیا تھا۔ دکانیں بند ہوگئی تھیں اور شیشے کے کواڑوں کے پیچھے لوگ میز کے گرد بیٹھے افطار کر رہے تھے۔ حمص یعنی کابلی چنے کی کھٹائی دار دال میں چمچہ چل رہا تھا۔ یہ دمشق تھا۔ مکتبوں کا دمشق۔ پرانی داستانوں کا دمشق۔ الف لیلوی دمشق۔ ایک گلی میں ہم نکلے تو بس ایک دکان ایک بزاز کی کھلی تھی۔ لیمپ کی روشنی میں بیٹھا حساب لکھ رہا تھا۔ سامنے گلی کے اس طرف ایک آدھی ڈھئی ہوئی گنبد دار عمارت کھڑی تھی۔ ہم نے پوچھا: کیوں میاں جی یہ مسجد ہے؟ بولے ہاں۔ ہم نے کہا۔ نام اس کا کیا ہے؟ معلوم ہوا۔ یہ سلطان صلاح الدین کے آقا سلطان نورالدین شہید کی مسجد ہے اور اسی

www.bookstenpoint.com

کے اندر اس کی تربت ہے۔ ڈیوڑھی بے چراغ تھی۔ ہم دبے پاؤں اندر گئے تو صحن میں بھی کوئی نہ تھا ہاں صحن سے پرے ایک دروازہ تھا اس کے پیچھے شاید کوئی ہوگا ہم نے وہیں سے فاتحہ پڑھی اور الٹے پاؤں لوٹ آئے۔ رات اتر آئی تھی۔ چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چودیس۔ لیکن ہمیں تو کوئی جلدی نہ تھی۔ ہم تو ان گلیوں میں گم ہو جانا چاہتے تھے جذب ہونا چاہتے تھے، یہاں کسی گائیڈ کی حاجت نہ تھی۔ گائیڈ تو رستہ ڈھونڈنے اور پتہ رکھنے کے لئے ہوتا ہے۔ گم ہونے اور بھولنے اور اپنے آپ کو کھونے کے لئے گائیڈ کی کیا حاجت۔ اور پھر ہم ان تاریک کیچڑ بھری گلیوں میں گم ہو گئے۔ کچھ یاد نہ رہا کہ کدھر کو جانا ہے۔ یہی گندی کیچڑ بھری گلیاں ہی تو ہمارے ماضی سے ہمارا رشتہ تھیں۔ ایک جگہ پھر کسی مدرسے کی اونچی ڈیوڑھی نظر آئی۔ ہم نے نام پڑھنے کے لئے ماچس جلائی لیکن کچھ نہ پڑھ سکے۔ گلی دور دور تک سنسان تھی۔ ایک جگہ چراغ جل رہا تھا۔ وہاں سے ایک آدمی ایک پیالہ لئے ہوئے نکلا اور پیشتر اس کے کہ ہم اس سے پوچھتے یا رفیقی! یہ کون سا مکتب ہے۔ دوسری گلی میں غائب ہو گیا۔ اور پھر اندھیرے سے مسجد اموی کے مینار پیدا ہوئے اور ہم نے حساب لگایا کہ ہم اس کے جنوبی دروازے پر نکل آئے تھے۔ یہاں ایک چبوترہ تھا۔ چبوترہ تو نہیں ایک نیچی دیوار تھی۔ پرانے وقتوں کے کسی پشتے کا حصہ۔ ہم ٹھیکی لینے کو رک گئے بیٹھ گئے۔ اور پھر اس پشتے کے نیچے سے کوئی بولا: یہاں ایک مندر تھا میں اس مندر کی آخری اینٹ ہوں۔ اس کے اوپر کا ردا بولا۔ میں اس کلیسا کی دیوار ہوں جو رومن قیصر آرکاٹیس نے اس مندر کی جگہ پانچویں صدی عیسوی میں بنایا اور پھر اس کے اوپر کے پتھر بولے۔ ہم اس خانہء خدا کے قدیم پتھر ہیں اور ہمیں پہلی صدی ہجری میں ولید بن عبدالملک بن مروان نے یہاں جمایا تھا۔ بارہ ہزار کاریگر اور معمار اور سنگتراش بلادِ روم سے آئے تھے اور شب و روز کام کرتے تھے۔ ایک کے بعد ایک سلطان، خلیفہ، پاشا، صوفی، درویش، متکلم یہاں آ کر سجدہ ریز ہوئے۔ ناگہاں شور سا اٹھا۔ فصیلوں پر چلو، فصیلوں پر چلو۔ یورپ کے قہرمان صلیبی پرچم لئے منزلیں مارتے یہاں آ پہنچے تھے۔ یہ فرانس کے لوئی ہفتم کا لشکر جرار ہے وہ جرمن کے

قیصر کونارڈ سوم کے زرہ پوش نائٹ گھوڑے بڑھاتے آ رہے ہیں۔ فصیلوں پر چلو۔ فصیلوں پر چلو۔ محاصرہ۔ محاصرہ۔ تیغوں کا رن پڑتا ہے۔ منجنیقیں چلتی ہیں، اللہ اکبر اللہ اکبر۔ اور پھر یہ بادل چھٹ جاتا ہے۔ اب ایوبیوں کا دور دورہ ہے۔ سلطان صلاح الدین اپنے سمند پر سوار تشریف لاتے ہیں۔ گلیوں میں ٹھٹ لگے ہیں۔ نقارہ بجتا ہے۔ ایوبی پرچم کھلتا ہے اور کھلتا چلا جاتا ہے اور بیت المقدس کو اپنے سایے میں لے لیتا ہے۔ اور پھر یہ نقارہ کسی اور قسم کے شور میں دب جاتا ہے۔ یہ کیا ہوا۔ یہ کیسے ہجوم ہیں۔ یہ سلطان غازی کی میت لحد میں اتاری جا رہی ہے۔ کل من علیہا فان۔ کل من علیہا فان..... لیکن دیکھو یہ پھر گھوڑوں کی ٹاپوں کا شور گونجا۔ یہ ہلاکو خاں کی فوج بے اماں ہے۔ گلیوں، محرابوں، ڈیوڑھیوں کے دروازے بند ہو گئے اور پھر ہلاکو خاں فصیلیں چیر کر چڑھ آیا اس مسجد کو جلا دو۔ ڈھیر کر دو۔ یہاں ہماری مسند بچھا دو اور پھر مسجد کی چھت جلنے لگی۔ ڈھیر ہو گئی۔ دمشق کے آسمان پر دھواں ہی دھواں پھیل گیا اور جب مطلع صاف ہوا تو ہلاکو بے نشان ہو چکا تھا۔ ایمان والوں نے مسجد پھر کھڑی کر دی تھی۔ ایک بار پھر مشرقی منارے سے پچاس مؤذنوں نے مل کر اذان دی۔ پھر مدرسے کھلے لیکن یہ دمشق تھا۔ ابھی اسے اور روندا جانا تھا۔ اب تیمور لنگ کی باری تھی۔ پھر فصیل شق ہوئی۔ طبل بجا۔ رایت کھلا اور دمشق غارت ہوا اور پھر مسجد سے شعلے بلند ہوئے اور اس کی لنڈ منڈ محرابیں اور دیواریں باقی رہ گئیں۔ یہ لشکر لوٹا تو دمشق کے بے مثال قالین بافوں کو بھی ہانکتا ہوا ساتھ لے گیا۔ ان کو ماوراءالنہر میں آباد کرو۔ دمشق کو اجاڑ دو۔ لیکن مسجد پھر کھڑی ہوئی دمشق پھر آباد ہوا حتیٰ کہ سلطان سلیم اوّل نے اسے تسخیر کیا۔ ایک کے بعد ایک سلطان کے نام کے خطبے یہاں پڑھے گئے۔ اور آخر ترکوں نے بھی گھوڑوں پر زینیں کسیں اور رخصت ہو گئے۔ پھر ایک دھواں دھار جنگ ہوئی۔ پھر فرانسیسی ان گلیوں میں دندنانے لگے۔ لیکن یہ محرابیں یہ ڈیوڑھیاں یہ آثار کوئی نہ مٹا سکا۔ دمشق تو گنج شہیداں ہے چلو فاتحہ پڑھو۔ حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کے مزار پر۔ عبداللہ بن مکتوم رضی اللہ عنہ کی تربت پر، عمر بن عبدالعزیز کی قبر پر سیدہ زینب۔ سیدہ سکینہ۔ اسماء بنت ابوبکر۔ سیدہ فاطمہ

www.pakistanipoint.com

صغیرہ بنت امام حسین رضی اللہ عنہ۔ ان قبرستانوں کے پھیلے ہوئے کھنڈروں میں کس کس موتی کو تلاش کرو گے۔ اور پھر ایک طرف سے تلاوت کی شیریں آواز آنی شروع ہوئی۔ اے دمشق رخصت۔ اے جامع اموی اے عظمت رفتہ کی سجدہ گاہ السلام۔ لیکن ابھی کہاں۔ ابھی تو دمشق کی گلیاں باقی ہیں۔ ہم نے سڑک پار کی اور درویش پاشا کی تربت کے پاس سے کاوا کاٹ کر پھر اندھی گلیوں کی محرابوں میں گم ہو گئے۔

www.pakistanipoint.com

جونیہ سے طرابلس تک

یہ بیروت ہے اور یہ بیروت میں ہماری آخری شام ہے اور خدا کو منظور ہوا تو ہمارے سفر کی آخری شام بھی۔ بیروت کا طوفانی سمندر دو راتوں سے بے طرح شور کر رہا ہے اور ہمیں اپنے ساحل پر بلا رہا ہے۔ جہاں آج کل شام کو دور دور تک کوئی متنفس نہیں ہوتا۔ گرمیوں کی شاموں کو یہیں ہم نے لوگوں کے میلے دیکھے تھے۔ تربوز، بھٹے اور نان پکتے پائے تھے۔ آج نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں۔ نہ وہ حُسن میں رہیں شوخیاں۔ یا تو موسم کے ساتھ رخصت ہو گئیں، یا چار دیواریوں میں، دیوان خانوں میں محصور ہو گئیں۔

شام ہے۔ تاریکی ہے۔ ابر ہے۔ بوندیں برس رہی ہیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے بادل بھی گرج اٹھتا ہے اور اس طوفان کے باوجود دور ابر کی دو ٹکڑیوں کے درمیان سے جانے کس تاریخ کا چاند جھانک رہا ہے۔

وہ سامنے حریصا کی پہاڑیاں نظر آتی ہیں اور اس کے دامن میں جونیہ قریہ ہے جہاں ہم نے پچھلے ہفتے ایک دن گزارا تھا۔ مس حلا الشیخی کہ یہاں ہماری رقافت پر مامور ہیں اپنی کار لے آئی تھیں اور منزل ہماری المکتبہ البوسیہ تھی یعنی سینٹ پال پبلشنگ ہاؤس۔ سینٹ پال ہوٹل سے سینٹ پال مکتبے تک ..... جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔ سوئے دار کی رعایت سے اس مکتبے کی چھت پر صلیب بھی نصب تھی۔ اور اس کے پیچھے کا پہاڑ بھی کلیساؤں اور صلیبوں سے پٹا تھا اور حریصا کے پہاڑ کی چوٹی پر ایک عیسائی دیوی کی بہت بڑی شبیہ تھی جس پر رات کو اس انداز سے روشنی ڈالی جاتی ہے کہ سارے میں یہی

www.pakistanipoint.com

چمچماتی دکھائی دیتی ہے۔ دوسرے گرجاؤں کی صلیبیں بھی رات کو روشن ہو جاتی ہیں۔ کسی مسجد کا مینار ان پہاڑیوں پر ہمیں نظر نہ آیا۔

جونیہ میں ہم نے عین کنار بحر پر مہربان اور شفیق اور سیہ پوش فادر جورج بالیکی کے ساتھ کھانا کھایا اور لسّی پی۔ ہماری نظر جو فراز کوہ کی طرف اٹھی تو بولے چلو گے اوپر؟ ہم نے کہا: کیسے؟ بولے۔ بجلی کے جھولے میں بیٹھ کر۔ جھولے میں بیٹھ کر لوہے کے تاروں سے لٹکے پہاڑ چڑھنے اترنے کے مواقع ہمیں جاپان میں بھی ملے اور سوئٹزرلینڈ میں بھی۔ لیکن ہم نے ان سے فائدہ نہ اٹھایا۔ یہاں ہم نے اپنا جی کڑا کیا اور کہا: ہاں کیوں نہیں۔ فادر بالیکی کے ایک جوان ساتھی نے جھولے میں چڑھنے سے انکار کر دیا کہ مجھے تو ہول آتا ہے مس حلا الشیخی ہچر مچر کرتی کرتے ہوئے شرما شرمی ہمارے ساتھ سوار ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد جب انہوں نے نیچے جھانکا اور زمین کو سخت، آسمان کو دور پایا تو ان کا دل بھی ڈوبنے لگا۔ اور خوف کے مارے ہمارا ہاتھ پکڑ کر ہم سے سمٹ کر بیٹھ گئیں۔ یہ مقام:

الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے ..... کی دعا کا تھا..... لیکن ہم جو جہاز میں بیٹھے کبھی نہ گھبرائے تھے۔ یہاں محض فادر اور مس حلا کو دکھانے کے لئے ہنس ہنس کے باتیں کرتے رہے۔ سچ یہ ہے کہ دل ہمارا بھی بیٹھا جا رہا تھا۔ چڑھائی اتنی زیادہ اور مسافت ایسی خاصی ہے کہ اوپر سے یہ بھی مشکل سے نظر آتا تھا کہ ہم کہاں سے چلے تھے۔ اب ہم قلعہ کوہ پر تھے۔ فادر ہمیں پاس کے گرجا میں لے گئے جس کے اوپر لبنان کی سب سے بڑی مورتی ہے۔ اسے شہر بیروت کی محافظ کہا جاتا ہے۔ یہ گرجا عجیب و غریب ساخت کا تھا اور یہاں سے گردونواح میں بیس بیس میل دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ فادر نے صلیب کا نشان بنایا۔ ہم ہلال والے کھڑے دیکھتے رہے۔

جن پبلشروں سے ہم ملے اور بیروت کے پبلشر تو ایک صدی سے مشہور ہیں ان میں سے بیشتر عیسائی ہیں۔ انہی نے پرانا عربی ادب چھاپا ہے اور اسلامی کتابیں بھی۔ یہ لوگ لبنان کے نولکشور ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ یہ کتابیں بہت خوبصورت چھاپتے ہیں۔

www.pakistanipoint.com

مولوی محبوب عالم نے اپنے سفرنامے میں بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ وہ مطبع الکاتولیکیہ اور مطبع آبائے یسوعیین میں گئے تھے اور ڈھیروں کتابیں خریدی تھیں۔ ہماری عربی کسی قابل نہ تھی پھر بھی ہم نے کچھ کلاسیکی شاعروں کے دیوان لئے۔ دیکھ کر آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ بیروت کے دوسرے کاروباریوں کے بورڈ پڑھیے تو بھی غالب اکثریت عیسائیوں کی نظر آئے گی۔ مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ان کا تناسب اب عیسائیوں کے برابر ہے۔ مولوی محبوب عالم نے 1900ء میں لکھا تھا کہ شہر میں مسلمان فقط ایک چوتھائی ہیں۔ عربی زبان سے محبت اور اسرائیل کی مخالفت میں ہم نے ان عیسائیوں کو مسلمانوں سے کم شمشیر برہنہ نہیں پایا۔

اگلے روز اسی راستے ہم طرابلس گئے تھے۔ طرابلس دو ہیں۔ ایک طرابلس الغرب جو لیبیا میں ہے اور ایک یہ کہ امتیاز کے لئے طرابلس الشام کہلاتا تھا۔ یہ لبنان کے انتہائے شمال میں ہے۔ اس کے بعد شام کی سرحد پار کریں تو حلب کے نواح میں جا پہنچیں گے۔ اسی ساحلی سڑک پر جونیہ سے کچھ آگے ببلوس کا قدیم شہر ہے۔ جہاں دنیا کے پہلے حروف تہجی ایجاد ہوئے اور زبان نے تحریر کا روپ پایا۔ لبنان قدیم زمانے میں فونیشیا کہلاتا تھا۔ اور یہاں کے لوگ فنیقی دنیا کی قدیم تہذیبوں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ یہ سمندری طاقت تھے اور ان کے سفینے روم اور کارتھیج تک مار کرتے تھے۔ ببلوس کے نئے شہر کے پہلو میں پرانے آثار میں سے کچھ تو چار اور پانچ ہزار سال پہلے کے مندروں کی باقیات ہیں جن کے گرد تین ہزار سال قبل مسیح کی فصیل کا کچھ حصہ اب بھی کھڑا ہے۔ عین ساحل پر ایک فرینکش قلعہ ہے۔ صلیبیوں کے زمانے کا۔ ولادت مسیح سے چار ہزار سال قبل یہ شہر سواحل فونیشیا کا دارالحکومت تھا اور بائبل کا نام اس شہر کے نام ببلوس سے مشتق ہے اسے دنیا کا قدیم ترین شہر بھی کہتے ہیں۔

طرابلس کہ اصل میں تریپولی یعنی ''سہ شہر'' ہے۔ قدیم زمانے میں صدر، صید، اور ارواد تین شہروں کے مہاجرین نے آباد کیا تھا اور ہر جماعت علیحدہ محلہ اور فصیل کے اندر رہتی تھی۔

www.pakistanipoint.com

رومیوں کے عہد میں یہ بڑا سر برآوردہ شہر تھا اور مسلمانوں کے عہد میں بھی، یہاں سے ریشم اور برتن دساور کو جاتے تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی اور سلطان بیبرس نے اس کا محاصرہ کیا۔ آخر سلطان قلاون نے اسے فتح کیا۔ یہاں صلیبی زمانے کا ایک قلعہ 17 جامع۔ بہت سے پرانے مدرسے اور کتب خانے۔ بارہ پرانی عیسوی خانقاہیں اور تجارت کے بازار ہیں۔ نیا طرابلس تو جدید شہر ہے لیکن پرانا شہر اپنے مکتبوں، جامعوں اور محراب دار گلیوں کے ساتھ چھوٹا دمشق کہلانے کا مستحق ہے۔

ہم قلعے کے دروازے پر پہنچے تو اسے بند پایا۔ کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ ان کی زبان ہمارے اور ہماری ان کے پلے نہ پڑی۔ اتنے میں ایک نوجوان باسکٹ پہنے آتے دکھائی دیئے۔

ہم نے پوچھا: انگریزی بولتے ہو؟

جواب ملا: ہاں بولتا ہوں۔

بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی انگریزی آٹھ دس لفظوں تک محدود تھی۔ نام ان کا احمد تھا۔ بولے اردو بھی بول لیتا ہوں۔ ہم نے کہا: بولو، فرمایا۔ ''بہت اچھا''۔ پتہ چلا کہ ان کو یہی لفظ آتا ہے۔ ''بہت اچھا''۔ جانے کہاں سے سنا تھا۔

یہ بیچارے بہت بھلے آدمی تھے۔ انہوں نے قلعے کے دروازے پر جا کر بابا علی کو بہت آوازیں دیں لیکن آج بابا علی نے پہلا روزہ ہونے کی وجہ سے جلد دروازہ بند کر دیا تھا۔ احمد میاں نے کہا: اب آپ شہر جایئے، چھ بجے کے بعد آیئے اس وقت بابا علی کا جی چاہا تو آپ کے لئے دروازہ کھول دے گا۔ آپ ایک آدھ لیرا نذر کریں تو دروازے کا کھلنا بڑی حد تک یقینی ہے۔

ہم نے کہا۔ اچھا، اب ہمیں بازار کا رستہ بتاؤ۔ بازار تو ہم پہنچ گئے لیکن وہ بھی بند ہو رہا تھا۔ طرابلس کی یادگار کے طور پر ہم نے کچھ خریدنا چاہا۔ سامنے کمبلوں کی دکان تھی۔ ہم نے ایک کمبل لیا۔ بھاؤ تاؤ کی گنجائش نہ تھی کیونکہ دکاندار افطار کے لئے گھر جانا چاہتا تھا۔ اس

www.pakistanipoint.com

نے کہا۔ بھاؤ تاؤ کرنا ہے تو کل صبح آئیو۔ ناچار ہم نے پیسے دیئے اور کمبل کو بغل میں مارا۔ یہاں میاں احمد بھی سلام علیک کر کے ہم سے رخصت ہو گئے۔ اور ہم طرابلس کی گلیوں میں گھومنے کے لئے تنہا رہ گئے۔

اس مسافت میں ہمارا کمبل بہت خلل انداز ہوا۔ ہم اسے ایک بغل سے دوسری میں منتقل کرتے رہے حتیٰ کہ ایک بار تو ہم اسے چھوڑنے پر بھی آمادہ ہو گئے تھے لیکن اب ہمیں نہ چھوڑ رہا تھا۔ طرابلس میں دیکھنے کی چیزیں تو بہت ہیں لیکن وقت کہاں تھا۔ مدرسوں اور مسجدوں اور محرابی بازاروں میں تو ہم جھانکے اور دور دور تک گئے لیکن قلعہ نہ دیکھ پائے۔ معلوم ہوا صبح دم دروازۂ خاور کھلے گا تو یہ بھی کھلے گا۔

چل خسرو گھر اپنے سانجھ بئی چو دیس۔ یہ تین مہینے بڑی مشکل سے تمام ہوئے ہیں اور ہم بغداد کا پروگرام منسوخ کر کے سیدھے کراچی آ رہے ہیں کیونکہ اے ہماری کلفتوں، عشرتوں اور حسرتوں کے شہر، ہم تجھ سے دور نہیں رہ سکتے۔ آوارہ گردی سے ہم نے اپنے دامن میں دیس دیس کی خاک تو جمع کر لی ہے لیکن ہمارے درد وہی ہیں کہ جو تھے۔ اور درماں وہی ہیں کہ جو تھے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی دیکھا۔ یہ دریائے سین ہے۔ یہ ٹیمز ہے۔ یہ مین ہے۔ یہ رائن یہ ایمسٹر۔ یہ رہی جینوا کی جھیل۔ اور یہ ہے زیورخ کا بحیرہ۔ دریائے ولتاوا۔ دریائے دستا، دریائے ڈینیوب دریائے نیل اور اب بحیرۂ روم، پانی ہی پانی، اس کے باوجود پیاس ہی پیاس۔

یہ کیا صدا کانوں میں آ رہی ہے۔ گرجا کا گھڑیال ہے۔ یا بانگِ رحیل ہے۔ اے مسافر اپنے آخری پڑاؤ سے اٹھ۔ الاؤ بجھا اور کجاوے میں زادِ سفر رکھ کر آج تیرا قافلہ جاتا ہے اے بلادِ مغرب کے شہرو، خدا حافظ۔ اے پیرس کے چوکو۔ لندن کی گلیو۔ برلن کی سڑکو۔ ایمسٹرڈم کے بازارو۔ جنیوا کے منارو۔ برن اور لوسرن کے سبزہ زارو۔ پراگ کے قلعو۔ وارسا کے خرابو۔ ویانا کی محلسراؤ۔ قاہرہ کی مسجدو۔ دمشق کے مکتبو اور طرابلس کی محرابو الوداع اور بیروت کی روشنیو تمہیں بھی الوداع۔

www.pakistanipoint.com

آج ہم اپنے سفر کی بارہویں ولایت اور ستائیسویں شہر کو خیر باد کہیں گے۔ اے وقت تیز ترک گامزن۔ اے گھڑی کی سوئیو۔ چلو چلو چلو۔ نسیم خوشدلی از فتح پوری آید۔ بس ایک شام اور درمیان ہے۔ پھر ہم اپنی کمر کھولیں گے۔ جوتوں سے ان رہ گزاروں کی گرد جھاڑیں گے۔ مسافرت کے دنوں اور ہم سفروں اور مہربانوں اور میزبانوں کو یاد کریں گے۔ صعوبتوں کو بھول جائیں گے

مدرسہ اور مدرسہ کے شاگرد دمشق میں

www.pakistanipoint.com

چل خسرو گھر اپنے

ایک بار ہمارے دوست ممتاز مفتی کے راولپنڈی سے کراچی آنے کا پرچہ لگا۔ تو ہم نے اور احمد بشیر نے ان کے خیر مقدم کے لئے لارنس روڈ سے کلن بینڈ والے کا باجا کرائے پر لیا۔ پوری ٹیم لینے کی تو مقدرت نہ تھی، نہ ہمیں خود ڈھول پیٹنا اور نفیری بجانا آتا ہے۔ بس ایک آدمی کی فیس دی۔ اس نے ترُ تک مٹکے میں سے نکال کر اپنی زرق برق جھالردار یونیفارم زیب تن کی اور ہمارے ساتھ ہولیا۔ یہ باکمال ایک ہاتھ سے ڈھول بجاتا تھا۔ دوسرے میں ٹرم پکڑے تھا۔ یہ تو دوساز ہوئے یورپ میں تو جہاں لیبر مہنگی ہوتی ہے۔ گلے میں تاشہ کہاروں کے پالکی میں ڈھول کا حساب ہمیشہ رہتا ہے۔ ایک آدمی تین تین چار چار باجے ایک ساتھ بجاتا ہے۔ منہ والا باجہ ہاتھ سے پکڑنے کی ضرورت نہیں۔ ڈھول کے ساتھ ایک کمانی لگی ہے اس میں وہ اٹکا رہتا ہے۔ ایک ذرا گردن جھکائی اور پھونک لگالی۔ اب دونوں ہاتھ فارغ ہیں۔ ایک سے ڈھول پر چوٹ لگایئے۔ دوسرے سے جھانجھ بجایئے یا سر کھجایئے۔ بہرحال ممتاز مفتی صاحب اس جلوس میں ایک نفری بینڈ کے پیچھے دولہا بنے جو چلے تو یہ منظر دیدنی تھا۔ ہوائی اڈے کے سارے مسافر دیکھنے کو جمع ہو گئے کہ اس کروفر سے یہ کس کی سواری باد بہاری جاتی ہے۔

یہ اعزاز ہماری نظر میں پنڈی سے آنے والوں کا تھا۔ ہم تو پھر ولایت سے آرہے تھے اور یاروں دوستوں کو لکھ دیا تھا کہ دیکھنا زیادہ تکلف نہ کرنا۔ یہ زیادہ ہار گجرے ڈھول تاشے سپاسنامے وغیرہ ہمیں پسند نہیں اگر ہوں تو بس ایک حد کے اندر ہوں۔ زندہ باد کے نعرے

www.pakistanipoint.com

لگانے والوں کا جلوس بھی زیادہ سے زیادہ ایک بس میں آ جائے۔ ہم گوشہ گیر فقیر آدمی ہیں۔ زیادہ طمطراق ہماری درویشانہ طبیعت کے منافی ہے۔ جنگ والے، ڈان والے اور ٹیلی ویژن والے بھی بس ایک ایک فوٹو گرافر ہماری تصویر وغیرہ لینے کو بھیجیں۔ ہجوم سے ہمارا جی گھبرا جاتا ہے۔

پھر واپس آنے والوں کے خیر مقدم کے کئی طرح کے کلمات ہم نے پڑھے اور سنے تھے۔ خوش آمدید۔ صفا آدردید۔ اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما۔۔۔ سروسوئے بوستان آید ہمے۔ اہلاً وسہلاً۔ جی آیاں نوں وغیرہ۔ ہمارا دل بھی کراچی کے قریب پہنچ کر گداز ہو گیا تھا اور ہم نہایت رقت سے آیا شہر بھنبھور آیا شہر بھنبھور نی'' گاتے اور آنسو پونچھتے چلے آ رہے تھے۔ اس بے تکلفی کا بُرا ہو۔ اول تو احباب میں سے کوئی ہوائی اڈے پر آیا نہیں، آیا تو بنکارا۔ ''جیسے گئے تھے ویسے ہی ہر پھر کے آ گئے''۔ دوسرا بولا: خیر سے بدھو گھر کو آئے۔ ایک شاعر نے تو ایک پرانے فارسی مصرعے..... ''چو بیاید ہنوز.....الخ'' سے تاریخ بھی نکالنے کی کوشش کی۔ غنیمت ہوا کہ نہیں نکلی۔

یہ سارا جی جلانے کا سامان تو تھا لیکن جب ہم نے پوچھا کہ لو گو باجے گاجے کہاں ہیں؟ جلوس کدھر ہے؟ کیا ایک آدھ ہار بھی تم نہ لا سکتے تھے۔ پیسے ہم دے دیتے۔ یہ کیا تماشا ہے تو سب آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گئے۔ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ خیر میاں آزاد۔ آج کل کے دوست ایسے ہی ہیں۔ ان کا گلہ نہ کرنا چاہئے۔

لیکن آنے والی جوئے کم آب کو سب سے پہلے کسٹم کے پلوں کے نیچے سے گزرنا پڑا۔ ہمارے پاس ایک سوٹ کیس تھا۔ ایک اور سوٹ کیس۔ ایک تھیلا۔ ایک اور تھیلا اور ایک اور تھیلا۔

کسٹم افسر نہایت مستعد آدمی تھے۔ فرمایا:

Have you anything to declare?

ہم نے کہا: ہم خدا کو حاضر ناظر جان کر اعلان کرتے ہیں کہ گذشتہ راصلواۃ بقیہ عمر ملک

اور قوم کی خدمت میں بسر کریں گے، خواہ اس کے لئے ہمیں اسمبلی میں کیوں نہ جانا پڑے۔

بولے: اس قسم کے اعلان سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ آپ کے سامان میں کوئی چیز ایسی تو نہیں جو قیمتی ہو جس پر کسٹم لگتا ہو۔

ہم نے کہا: کیوں نہیں۔ بڑی بڑی انمول چیزیں ہیں۔ ہم نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک چیز نکالی۔ یہ تھی۔ انگلش جرمن اور جرمن انگلش ڈکشنری۔

بے توجہی سے دیکھ کر فرمایا: ''اور کیا ہے؟''

اب کے ہم نے ہاتھ ڈالا تو فرنچ انگلش اور انگلش فرنچ ڈکشنری دستیاب ہوئی۔

فرمایا: ''اس کے نیچے کیا ہے؟''

وہاں سے ڈچ زبان کی لغت برآمد ہوئی۔

اب انہوں نے تھیلا لے کر خود ٹٹولا۔ اس کے نیچے چیک زبان کی لغت تھی پولش زبان کی روزمرہ بول چال کی کتاب تھی۔ اٹالین زبان کی گرامر تھی۔

بولے: بس؟

ہم نے کہا: بس کیوں۔ عربی زبان کے لغات اس دوسرے تھیلے میں ہیں ان کے علاوہ ہر شہر کی گائیڈ بک، نقشہ اور پکچر کارڈ ہیں، دکھائیں نکال کر؟

بولے: نہیں۔

اب انہوں نے ہمارے سوٹ کیس کو ٹھوکا دیا اور کہا یہ بھی ذرا دیکھیں۔ وہاں بس کچھ کپڑے تھے ہمارے۔ کچھ پرانے کچھ نئے۔ دُھلی ان دُھلی بنیانیں۔ موزے وغیرہ۔ مولوی محبوب عالم کا سفرنامہ۔ ہمارا غیر مطبوعہ دیوان۔

ایک ڈبہ ہم نے ان کپڑوں کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ ہمارا خیال تھا اس پر کسی کی نظر نہ جائے گی لیکن کسٹم والوں کی نگاہیں بہت تیز ہوتی ہیں انہوں نے اسے کھینچ لیا۔ ہم نے کہا۔ نہ نہ۔ اسے مت کھولئے گا۔ اس میں کچھ بھی نہیں ہے لیکن انہوں نے کھول ہی لیا۔

اس ڈبے کے اندر سے ایک اور ڈبہ نکلا ایک اور.....

www.pakistanipoint.com

ایک اور.....اب لفافے شروع ہوئے ایک کے اندر دوسرا.....دوسرے کے نیچے تیسرا ..... بڑے لفافے ..... درمیانے لفافے ..... چھوٹے لفافے .....سب سے اندر کا لفافہ انہوں نے کھولا۔ اس میں کچھ بھی نہ تھا۔

فرمایا: اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔

ہم نے کہا: کیوں نہیں ہے؟ آنکھوں والوں کے لئے بہت کچھ ہے ہم سے پوچھئے، ہم جاتے ہوئے اپنے ہاں کی ہینڈی کرافٹ شاپ سے کچھ تحفے لے گئے تھے، ان لوگوں نے اخبار میں یا براؤن پیپر میں باندھ کر دیئے تھے، ہمیں بہت شرم آئی، اب یہ دیکھئے، یورپ والے کتنی عمدہ پیکنگ کرتے ہیں۔ اس ڈبہ میں ہمارا سوٹ تھا اور اس دوسرے میں جوتا تھا۔ باقی لفافوں میں ہماری قمیضیں اور سوئٹر وغیرہ تھے۔ اس لفافہ میں ہم ایک بار ڈبل روٹی لائے تھے۔ لوگ تو ایسی چیزیں بے پروائی سے پھینک دیتے ہیں ہمارے جی نے یہ گوارا نہیں کیا۔ سینت سینت کر رکھتے رہے۔ اب یہ چیزیں ہم اپنے دکانداروں کو دکھائیں گے اور شرم دلائیں گے کہ تم لوگ ایسے ڈبوں اور لفافوں میں چیز رکھ کر دیا کرو تو ہم کیوں نہ لیں۔ جب ہم ولایت میں اتنی ڈھیر ساری خریداری کرتے ہیں تو یہاں کے دکاندار تو پھر اپنے بھائی ہیں، اپنے گرائیں ہیں..... یہ سارے ڈبے اور لفافے جمع کرنے اور رکھنے میں ہمیں اتنی محنت کرنا پڑی۔ جرمنی سے، انگلستان سے، ہالینڈ سے، سوئٹزرلینڈ سے اور آپ نے ٹکا سی زبان ہلا دی کہ اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ جیسے یہ سب ردّی چیزیں ہوں۔

فرمایا: جایئے، صاحب جایئے۔

ہم نے کہا: یہ تیسرا تھیلا بھی دیکھ لیجئے!

بولے: نہیں، نہیں، نہیں نہیں ..... جایئے۔ ہوا یہ کہ ایک اور صاحب آ کر ان کے کان میں کہہ گئے کہ یہ تو فلاں صاحب ہیں۔ کیوں اپنا وقت ان پر ضائع کرتے ہو یہ بھی اچھا ہوا۔ کیونکہ ہمارے تمام ہیرے اور زمرد، پونڈوں اور ڈالروں کے نوٹوں کی گڈیاں، سونے کی اینٹیں، جڑاؤ گھڑیاں سلک کے تھان، افیم اور کوکین وغیرہ کے ڈلے اسی تھیلے میں تھے۔

www.pakistanipoint.com

www.pakistanipoint.com

ڈائری لکھنے اور چھپوانے کا فائدہ یہ ہوا کہ احباب کو اپنے متعلق عجیب طرح متفکر پایا۔ رونی صورتیں، سوکھے چہرے، ہمدردی لبوں پر۔ معلوم ہوا ہماری فلاکت اور بے زری کا سن کر بعضوں نے تو ہمارے لئے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا ہے ابنِ انشا ریلیف فنڈ کھول دیا ہے جس میں دیئے جانے والے عطیات پر انکم ٹیکس بھی معاف رہے گا۔ بعض اہلِ درد دکانداروں اور چائے خانوں والوں نے بھی جو جنگ پڑھتے ہیں۔ از خود ہمارے نام کی طشتریاں کونٹر پر رکھ دی ہیں۔ جن لوگوں سے ہمیں اس قسم کے تقاضے کا کھٹکا تھا کہ ہمارا ٹیپ ریکارڈ کدھر ہے، ہمارا کیمرہ نکالو وغیرہ۔ انہوں نے بلائیں لے کر اور آنسو پی کر کہا۔ یہاں تم آ گئے ہو سب چیزیں آ گئیں، بلکہ ایک مہربان نے تو ہماری دلجوئی کے لئے ایک ٹرانزسٹر بھی بازار سے خرید کر ہماری نذر کیا ہے۔

WWW.PAKISTANIPOINT.COM